اسلام کا نظامِ طلاق

نقل و عقل کی روشنی میں

مرتّب

حضرت مولانا محمّد عرفان ثاقب صاحب قاسمی

بانی و مہتمم جامعۃ السعادۃ و جامعہ اسعاد البنات
قصبہ کیرانہ، ضلع شاملی، یوپی

ناشر

تحقیقاتِ شرعیہ اکیڈمی

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ
ضلع شاملی، یوپی، انڈیا۔ پن کوڈ: ۲۴۷۷۷۴

اسلام کا نظامِ طلاق

نقل و عقل کی روشنی میں

مصنّف

حضرتؒ مولانا محمّد عرفان ثاقِب قاسمی

بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ وڈائریکٹر تحقیقاتِ شرعیہ اکیڈمی کیرانہ

شاخ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

ناشِر

تحقیقاتِ شرعیہ اکیڈمی

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ

ضلع شاملی، یوپی، انڈیا۔ پن کوڈ: ۲۴۷۷۷۴

تفصیلات

نام کتاب : اسلام کا نظامِ طلاق

مصنّف : مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی

صفحات : ۷۲

تعداد : گیارہ سو

اشاعت : ۵؍ذی قعدہ ۱۴۴۵ھ - ۱۴؍مئی ۲۰۲۴ء

ناشر : تحقیقات شرعیہ اکیڈمی، کیرانہ

ناشر

تحقیقات شرعیہ اکیڈمی

محلہ ابراہیم پورہ (آل کلاں) شاملی روڈ، کیرانہ
ضلع شاملی، یوپی، انڈیا۔ پن کوڈ: ۲۴۷۷۷۴

فہرست

۞۞۞

تقریظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی رسولہ الکریم، أما بعد

اسلام کا نظامِ طلاق ایک ایسا عادلانہ اور منصفانہ نظام ہے جو مطابق نقل بھی ہے اور مطابق عقل بھی۔ انتہائی ناپسندیدہ ہونے کے باوجود شریعت نے اسے اسی لیے جائز رکھا کہ یہ انسان کی ایک بنیادی ضرورت ہے اور فطرتِ انسانی کے مطابق ہے۔

نکاح اگر ایک مرد وعورت کو باہم جوڑتا ہے اور پیار ومحبت کے ساتھ مل کر زندگی گذارنے کا تقاضا کرتا ہے تو یہ بھی ضروری تھا کہ خدانخواستہ اگر کسی وجہ سے دونوں میں باہم اتفاق نہ ہوسکے تو علاحدگی کی راہ کھلی رہے، ورنہ یہی نہیں کہ مقصدِ نکاح فوت ہوگا، بلکہ دونوں کی زندگی ایک مصیبت بن کر رہ جائے گی۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ طلاق کو ظالمانہ نظام کہتے ہیں یا خلافِ عقل کہتے ہیں درحقیقت انہی کی عقلوں پر پتھر پڑا ہوا ہے۔

برادر مکرّم حضرت مولانا محمد عرفان ثاقب قاسمی زید مجدہٗ بانی ومہتمم جامعۃ السعادۃ کیرانہ، شاملی نے زیر نظر کتاب ''اسلام کا نظامِ طلاق: نقل وعقل کی روشنی میں'' میں اسلام کے نظامِ طلاق کو مفصل و مدلل بیان کیا ہے اور ساتھ ہی اس کے عین فطرت انسانی کے مطابق ہونے کو بھی واضح کیا ہے۔

کتاب اپنے موضوع پر انتہائی جامع اور مدلل ہے اور اس لائق ہے کہ معاشرے کے ہر فرد تک پہنچے، تاکہ طلاق کے حوالے سے جو بے احتیاطی ہے یا غلط فہمی ہے وہ دور ہو۔

دعا ہے کہ اللہ ربّ العزت مصنّف کی دیگر کتابوں کی طرح اسے بھی قبولیت عامہ سے نوازے اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔ (آمین)

صغیر احمد پرتاپ گڑھی

استاذ حدیث جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند

۵/ذی قعدہ ۱۴۴۵ھ - ۱۴/مئی ۲۰۲۴ء

پیش لفظ

نحمدہٗ و نصلي علیٰ رسولہ الکریم، اما بعد!

اس وقت اسلام جن داخلی و خارجی مسائل سے دو چار ہے، ان میں سے ایک طلاق بھی ہے۔ اسلام کا نظام طلاق جو انتہائی عدل وانصاف اور مساوات پر قائم ہے، افسوس کہ اس وقت عقل ودانش اور مساوات کے نام پر اسے ایک ظالمانہ قانون بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ اعتراضات کئے جارہے ہیں ان کی نہ تو کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی عقل ودانش سے ان کا کوئی تعلق ہے، تمام اعتراضات جہالت، حماقت اور حقیقت واقعیہ سے عدم واقفیت پر مبنی ہیں، نکاح وطلاق کے تمام مسائل قرآن وحدیث سے مستنبط ہیں اور انسانی فطرت ومساوات انسانی کے بالکل مطابق ہیں، اس میں کسی بھی انسان کو خواہ وہ افراد ہوں یا حکومتیں، کسی بھی تبدیلی اور ترمیم وتنسیخ کا کوئی حق نہیں ہے۔

خیال ہوا کیوں نہ ایک مختصر سے رسالہ میں ان اعتراضات کا نقل وعقل اور فرمودات اکابر کی روشنی میں سرسری جائزہ لے کر لوگوں کو صحیح صورت حال سے واقف کرایا جائے اور میڈیا کے ذریعہ پھیلائے جانے والے زہر کو کم کیا جائے۔ یہ مختصر سا رسالہ اسی مقصد کی تکمیل ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ رب العزت اسے قبول فرمائے اور ذخیرۂ آخرت بنائے۔ (آمین)

محمد عرفان ثاقب قاسمی

۵/ ذی قعدہ ۱۴۴۵ھ - ۱۴/ مئی ۲۰۲۴ء

خاندانی نظام

عائلی زندگی معاشرے کا وہ بنیادی پتھر ہے جس پر تہذیب وتمدن کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، اگر معاشرے میں خاندانی نظام کا ڈھانچہ توڑ پھوڑ اور افراتفری کا شکار ہو، تو خواہ زمینیں سونا اگل رہی ہوں، یا مشینوں سے لعل وجواہر برآمد ہو رہے ہوں، زندگی سکون سے محروم ہوجاتی ہے، آج یورپ اور امریکہ کی وہ دنیا جو سیاسی اور معاشرتی اعتبار سے پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کے لیے قابل رشک سمجھی جاتی ہے۔ خاندانی نظام کے درہم برہم ہونے کی وجہ سے اسی سنگینی سے دو چار ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت کی ریل پیل اور تیز رفتار مادی ترقی کے باوجود لوگ ایک انجانے اضطراب کا شکار ہیں، اپنی اندرونی بے چینی سے گھبرا کر کوئی یوگا کے دامن میں پناہ لے رہا ہے، کوئی منشیات اور خواب آور دواؤں میں سکون ڈھونڈ رہا ہے اور بالآخر جب ان میں سے کوئی چیز اس بے چینی کا علاج نہیں کر پاتی تو آخری چارہ کار کے طور پر لوگ خودکشی کر رہے ہیں اور خودکشی کرنے والوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

حضرت مولانا محمد حنیف صاحب اپنا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں سوئزرلینڈ میں تھا۔ میرے میزبانوں نے آمدورفت کے لیے جس گاڑی کا انتظام کیا تھا اس کا ڈرائیور آرلینڈ نامی ایک اطالوی نسل کا تعلیم یافتہ آدمی تھا اور انگریزی روانی سے بول لیتا تھا۔ وہ چندروز میرے ساتھ رہا اس کی عمر تقریباً چالیس سال کو پہنچ رہی تھی، لیکن ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ہمارے معاشرے میں شادی اکثر اس لیے بے مقصد ہوجاتی ہے کہ شادی کے بعد شوہر اور بیوی کے درمیان زندگی کی پائیدار

رفاقت کا تصور بہت کمیاب ہے۔ اس کے بجائے شادی ایک رسمی تعلق کا نام رہ گیا ہے، جس کا مقصد بڑی حد تک ایک دوسرے سے مالی فوائد حاصل کرنا ہوتا ہے۔ بہت سی خواتین شادی کے بعد جلد ہی طلاق حاصل کر لیتی ہیں اور یہاں کے قوانین کے مطابق شوہر کی جائیداد کا بڑا حصہ ہتھیا کر اسے دیوالیہ کر جاتی ہیں اور یہ پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ کونسی عورت صرف شوہر کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے شادی کر رہی ہے اور کون وفاداری سے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے۔ اس نے حسرت بھرے انداز میں یہ بات کہہ کر ساتھ ہی یہ تبصرہ بھی کیا کہ آپ کے ایشیائی ممالک میں شادی واقعی بامقصد ہوتی ہے۔ اس سے ایک جما ہوا خاندان وجود میں آتا ہے جس کے افراد آپس میں دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں، ہم ایسے خاندی ڈھانچے سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین یا بہن بھائی تمہیں اچھی بیوی کی تلاش میں مدد نہیں دیتے؟ اس نے یہ سوال بڑے تعجب کے ساتھ سنا، اور کہنے لگا کہ ''میرے والدین تو رخصت ہو چکے۔ بہن بھائی ہیں، لیکن ان کا میری شادی سے کیا تعلق؟ ہر شخص اپنے مسائل کو خود ہی حل کرتا ہے۔ میری تو ان سے ملاقات کو بھی سال گزر جاتے ہیں''۔

یہ ایک ڈرائیور کے تاثرات تھے۔ ہوسکتا ہے کہ اس نے اپنے ذاتی حالات کی وجہ سے کچھ مبالغے سے بھی کام لیا ہو، لیکن مغرب میں خاندانی ڈھانچے کی ٹوٹ پھوٹ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر زیادہ دلائل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ بات پوری دنیا میں مشہور ومعروف ہے۔ مغرب کے اہل فکر اس پر ماتم کر رہے ہیں اور جوں جوں اس کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ اتنی ہی تیز رفتاری سے خاندان کا ڈھانچہ مزید تباہی کی طرف جارہا ہے۔

سابق سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف کی ایک کتاب ہے: Perestroika، جو انہوں نے اپنے اقتدار کے زمانے میں لکھی تھی، نہ صرف سوویت یونین بلکہ پورے مغرب کے سماجی اور معاشی نظام پر ایک جرأت مندانہ تبصرے کی حیثیت رکھتی ہے اور اس کے بعض حصوں میں آج بھی غور وفکر کا بڑا سامان ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے ''خواتین اور خاندان'' کے عنوان سے خاندانی نظام کی شکست وریخت پر بھی

بحث کی ہے، انہوں نے شروع میں لکھا ہے کہ تحریک آزادیٔ نسواں کا یہ پہلو تو بیشک قابلِ تعریف ہے کہ اس کے ذریعہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق ملے۔ عورتیں زندگی کے ہر شعبے میں مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کے قابل ہوئیں اور اس کے نتیجے میں ہماری معاشی پیداوار میں اضافہ ہوا، لیکن آگے چل کر وہ لکھتے ہیں جس کا اردو ترجمہ یہ ہے:

''لیکن اس اپنی مشکل اور جرأت مندانہ تاریخ کے پچھلے سالوں میں ہم خواتین کے ان حقوق اور ضروریات کی طرف توجہ دینے میں ناکام رہے جو ایک ماں اور گھر کی حیثیت میں نیز بچوں کی تعلیم وتربیت کے سلسلے میں ان کے ناگزیر کردار سے پیدا ہوتے ہیں۔ خواتین چونکہ سائنسی تحقیق میں مشغول ہوگئیں، نیز زیر تعمیر عمارتوں کی دیکھ بھال میں، پیداواری کاموں اور خدمات میں اور دوسری تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف رہیں۔ اس لیے ان کو اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ خانہ داری کے روزمرہ کے کام انجام دے سکیں، بچوں کی پرورش کرسکیں اور ایک اچھی خاندانی فضا پیدا کرسکیں۔ اب ہمیں اس حقیقت کا انکشاف ہوا ہے کہ ہمارے بہت سے مسائل جو بچوں اور نوجوانوں کے رویئے، ہماری اخلاقیات، ثقافت اور پیداواری عمل سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے بھی کھڑے ہوئے ہیں کہ خاندانی رشتوں کی گرفت کمزور پڑ گئی ہے اور خاندانی فرائض کے بارے میں ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پروان چڑھا ہے۔

ہم نے عورتوں کو ہر معاملے میں مردوں کے برابر قرار دینے کی جو مخلصانہ اور سیاسی اعتبار سے درست خواہش کی تھی یہ صورت حال اس کا تضاد آفرین نتیجہ ہے، اب اپنی تعمیر نو کے دوران ہم نے اس خامی پر قابو پانے کا عمل شروع کردیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہم پریس میں، عوامی تنظیمات میں، کام کے مقامات میں اور خود گھروں میں ایسے گرما گرم مباحثے منعقد کررہے ہیں، جن میں اس سوال پر بحث کی جارہی ہے کہ عورت کو اس کے خالص نسوانی مشن کی طرف واپس لانے کے لیے ہمیں کیا اقدامات کرنے چاہئیں۔''

یہ ایک ایسے سیاسی لیڈر کا تبصرہ ہے جس کے معاشرے میں خاندان سے متعلق یا مرد وعورت کے حقوق وفرائض کے بارے میں کسی قسم کی مذہبی اقدار کا کوئی تصور یا تو موجود

نہیں ہے یا اگر ہے تو اسکی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔لہٰذا خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ پر اس کا اظہار افسوس کسی اعلیٰ آسمانی ہدایت کے زیر اثر نہیں، بلکہ اس کے صرف ان نقصانات کی بناء پر ہے جو ٹھیٹھ مادی زندگی میں اسے آنکھوں سے محسوس ہوئے۔ایک مسلمان کی حیثیت صرف ظاہری اور مادی یا دنیوی نفع ونقصان کے ہی نہیں، بلکہ ان آسمانی ہدایات کی بھی پابند ہے، جو قرآن وسنت کے واسطے سے ہمارے لیے واجب العمل ہیں،لہٰذا خاندان کی ابتری صرف ہمارا سماجی اور معاشرتی نقصان ہی نہیں ہے بلکہ ہمارے عقیدے ہمارے نظریہ حیات اور ہمارے دین کے لحاظ سے بھی ایک بہت بڑا فساد ہے جو ایک مسلم معاشرے میں کسی بھی طرح قابل برداشت نہیں۔

جب سے ہمارے درمیان مغربی افکار کا ایک سیلاب امڈ آیا ہے اور بالخصوص ٹی وی، ریڈیو، انٹرنیٹ اور انگریزی فلموں کی بہتات نے ہمارے معاشرے پر ثقافتی یلغار شروع کی ہے اس وقت سے ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر انہیں معاشرتی تصورات کی طرف بڑھ رہے ہیں جن کی داغ بیل مغرب نے ڈالی تھی۔

الحمد للہ ابھی ہمارا خاندانی نظام درہم برہم نہیں ہوا ہے،لیکن جس رفتار سے مغربی ثقافت ہمارے درمیان پھیل رہی ہے، انگریزی فلموں کے سیلاب نے مغربی طرز زندگی کو جس طرح گھر گھر اور گاؤں گاؤں پھیلا دیا ہے۔جس طرح بے سوچے سمجھے خواتین کو گھروں سے نکالنے اور انہیں ایک عاملِ معیشت بنانے پر زور دیا جارہا ہے اور گھر وخاندان کے بارے میں اسلامی تعلیمات سے جس تیزی کے ساتھ دوری اختیار کی جارہی ہے۔ وہ مستقبل میں ہمارے خاندانی نظام کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے جس کی روک تھام آج ہی سے ضروری ہے اور اس روک تھام کا طریقہ اسلام کی ان معتدل تعلیمات کی ٹھیک ٹھیک پیروی کے سوا کچھ نہیں، جو نہ مشرقی ہیں، نہ مغربی جن کا ماخذ ومنبع وحی الٰہی ہے اور وہ ایک ایسی ذات کی وضع کردہ تعلیمات ہیں جو انسانی کے حال ومستقبل کی تمام ضروریات سے بھی پوری طرح باخبر ہے اور انسانی نفس کی ان چوریوں کو بھی خوب جانتی ہے جو زہر ہلاہل پر قند وشکر کی تہیں چڑھانے میں مہارت تامہ رکھتی ہیں۔

لہٰذا ہمارا کام وقت کے چلتے ہوئے نعرے کے پیچھے چل پڑنا نہیں ہے، بلکہ اسے قرآن وسنت کی کسوٹی پر پرکھ کر یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ ہمارے مزاج ومذاق کے مطابق ہے یا نہیں جب تک ہم میں یہ جرأت اور یہ بصیرت پیدا نہ ہوگی ہم باہر کی ثقافتی یلغار کے لیے ایک تر نوالہ بنے رہیں گے او ہماری اجتماعی زندگی کی ایک ایک چول رفتہ رفتہ ہلتی چلی جائے گی۔

ہماری عاجزانہ گذارش ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو اولاد سے نوازا ہے تو اس کا شکر یہ بھی ہے کہ ان بچوں پر توجہ دیجئے، ان معصوم پھولوں کی قدر کیجئے، ان کی معمولی معمولی یا بلا اختیا ر بڑی بڑی غلطیوں پر آپے سے باہر نہ ہویئے، نہ اس معصوم بچے کو ماریئے، بلکہ خود احتیاط کیجئے، کہ اپنی چھوٹی چھوٹی اہم اشیاء ایسی جگہ نہ رکھیں جہاں بچوں کے ہاتھ پہنچ سکیں۔

غور کیجئے! نیوٹن ۱۵/سال سے ایک کتاب تیار کر رہا تھا، تھوڑی دیر کے لیے وہ کسی وجہ سے اٹھا تو اس کے کتے کا پاؤں موم بتی پر لگا جس سے موم بتی گر گئی اور مسودہ کے کافی صفحات جل گئے، تو اس نے تعجب سے کتے سے کہا:

''ہائے میں تمہیں کیا کہوں.................''۔

یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنی محنت میں لگ گیا اور اس کا کہنا ہے کہ میں نے دوبارہ محنت کر کے جمع کرنا شروع کر دیا اور تھوڑے عرصہ کی محنت سے میں نے اس پرانے مسودہ سے بہت ہی بہتر مسودہ جمع کر لیا۔ لہٰذا آپ بھی بڑا دل رکھتے ہوئے بچوں کی چھوٹی چھوٹی کوتاہیوں کو معاف کر دیجئے، اس پر پورے گھر کو سر پر نہ اٹھایئے، اسی طرح نہ ان کی بیماریوں، کمزوریوں پر پریشان اور مایوس ہویئے، یہ سمجھ لیجئے، بس جس گھر میں بچے ہوں گے اس میں یہی راحت ہے کہ آج کسی کو نزلہ ہے کسی کو بخار ہے، کسی نے کوئی چیز توڑ دی کوئی شور مچا رہا ہے، کوئی نیند خراب کر رہا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ ان سب تکلیفوں اور پریشانیوں کو ہنستے ہنستے قبول کیجئے، اور بھول جایئے، کہ گزشتہ کل کی پریشانی آج دوبارہ یاد کر کے خود اپنے آپ کو اپنی اہلیہ کو اپنے بچوں کو پریشان نہ کیجئے۔

یاد رکھئے! اگر میاں بیوی میں ہر وقت کی تو تو میں میں......در در بک بک......ختم ہو جائے تو یہ معصوم سے پھول جیسے بچوں پر بہت بڑا رحم ہوگا کہ وہ اس محبت اور سکون کی فضا میں

پروان چڑھ کر اعتماد والے بنیں گے، تمام نفسیاتی بیماریوں اور الجھنوں سے دور رہیں گے۔

ورنہ جھگڑوں کے ماحول میں گھٹ گھٹ کر پلنے والے بچے سہمے سہمے رہتے ہیں، خود اعتمادی سے محروم ہو جاتے ہیں، اپنے دل کی بات ماں باپ دونوں ہی سے نہیں کہہ سکتے خواہ ماں کو بے بس سمجھ کر............ یا باپ کو ظالم سمجھ............ کہ جو ہماری ماں کو ہی رلاتے رہتے ہیں وہ ابو ہماری بات کیا مانیں گے............ اور ماں باپ کو جھگڑتا دیکھ کر یا ماں کو ہر وقت دادی، پھوپھیوں سے ڈرتا دبتا دیکھ کر ان بچوں کی خداداد صلاحتیں اور قابلیتیں (جن سے وہ نہ جانے دین و دنیا کے اعلیٰ سے اعلیٰ کیا کیا کام کر جاتے) ختم ہو جاتی ہیں۔

اسکولوں اور مدرسوں کے مختلف بچوں پر آپ تحقیق اور غور فکر کریں تو آپ کو یہ بات محسوس ہوگی کہ (۱) کسی بچے کے بار بار فیل ہونے (۲) پڑھائی میں کثرت سے غیر حاضر ہونے (۳) کلاس اور درسگاہ میں بھی گم صم رہنے (۴) کھیل کود میں حصہ نہ لینے اور استاد کے پوچھنے پر، جواب معلوم ہونے کے باوجود اور سبق یاد کر لینے کے باوجود زبان سے دل کی بات نہ بتا سکنے کی اصل وجہ وہی سہم اور گھٹن اور خود اعتمادی سے محرومی...... یا احساسِ کمتری ......کی بیماری ہے۔

جو ماں باپ کی طرف سے گھر کی فضا خراب کر دینے کی وجہ سے ان کو لگی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جس معصوم ذہن پر ہر وقت باپ کا طمانچہ............ اور ماں کے بہتے ہوئے آنسوؤں............ کا تصور طاری رہتا ہو یا جس معصوم کے کانوں میں ابا یا دادی اور پھوپھی سے جھڑکی............ باورچی خانے میں روتی ہوئی ماں کی سسکیوں کی آوازیں گونجتی رہیں یا جس کے ذہن پر ابا اور دادی سے چھپ کر امی کو تنہائی میں مصلیٰ پر گھنٹوں روتا ہوا دیکھنے کا منظر چھایا رہے...... وہ بچہ کبھی بھی دوسرے کھلتے ہوئے بچوں کے برابر نہیں ہو سکتا۔

لہٰذا آپ اللہ کے واسطے اپنے بچوں پر ہی رحم کھاتے ہوئے اس بات کا اہتمام کریں کہ آپ کو بیوی یا بچوں کی کسی غفلت اور لا پرواہی سے غصہ نہ آئے اور اگر غصہ آ ہی گیا تو آپ بچوں ہی کی تربیت کی خاطر...... انہیں پر رحم کرتے ہوئے خاموش ہو جائیں اور معاملہ رفع دفع کرنے کی کوشش کر لیں اور اس وقت صبر کرنے اور معاف کرنے کے فضائل سوچیں کہ

آج میں نے ان کو معاف کر دیا تو اللہ تعالیٰ معاف کر دیں گے اور ہر بچے کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھائیں، اور ان کو دعا دے کر آئندہ کے لیے موقع عطا فرمائیں، اور اس کے لیے اسلام اور تربیت اولاد، مثالی ماں، جو تم مسکراؤ تو سب مسکرائیں، بچوں کی تعلیم و تربیت اسلامی تعلیمات کی روشنی میں، جیسی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

نکاح ایک ایسی عظیم نعمت ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں ہی اس سے بحکم خداوندی فائدہ اٹھاتے ہیں اور جہاں گناہ سے بچنا اور جائز فطری خواہش، حلال طریقوں پر پوری کرنا اس کا ایک اہم ترین فائدہ ہے بلکہ نکاح کی اصلی غرض وغایت یہی ہے، بالکل اسی طرح نکاح کی اصل غایت حصول اولاد بھی ہے اور یہ نتیجہ عام طور پر مرتب ہوتا ہے، اب اولاد جیسی نعمت جب مل گئی اور ان کی نگہداشت نہ ہوئی اور وہ تربیت نہ ہوئی جو شرعاً وعقلاً مطلوب ہے، تو اس صاحب اولاد جوڑے نے اولاد کی قدر نہ کی۔ مثلاً کسی بھی وجہ سے ماں نے بچہ کو خود دودھ نہ پلایا یا مطلوبہ شرعی مدت رضاعت پوری نہ کی یا بچے کی بڑھتی عمر کے ساتھ جو لازمی مراحل ہیں ان کی تکمیل میں دراڑیں پڑ گئیں۔

بچوں کے اخلاقی معیار...... بات چیت کے انداز............اور اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے کے طریق...... کسی کے پاس کوئی چیز دیکھ کر غیر معمولی بدتمیزی والی ضد کرنا، پورے گھرانے کی ایسی ساکھ خراب کرتے ہیں کہ اس بکھرے ہوئے نظام کا اکثر لوگوں یا ملنے جلنے والوں کی زبانوں پر تذکرہ ہوتا ہے اور شوہر بھی تھکا ہارا اپنے اور اپنے گھرانے سے متعلق ایسے جملے سن کر کہ ''پورا گھرانہ بے تکا ہے'' ''بچوں کو کیسے اٹھا رہے ہیں'' وغیرہ............اور زیادہ دل گرفتہ ہوتا ہے کیا آپ نے ان تمام امور کی جڑ اور بنیاد پر غور کیا ہے، اس میں سے ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ ہم لوگ دین سے کافی دور ہیں لہٰذا ہمیں چاہئے کہ اپنے گھروں میں دینی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو پورے دین پر عمل کرنے والا بنائے اور دوسری بڑی اہم وجہ یہ ہے کہ بچوں پر مناسب توجہ نہ دینا، ان کی تربیت کی فکر نہ کرنا ان کو پیار ومحبت نہ دینا، ان پر انفرادی توجہ نہ دینا، ان کے لیے دعائیں نہ کرنا وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایسی اہم وجوہات ہیں جن کی بناء پر بچوں کی صحیح تربیت نہیں ہو رہی ہے، تیسری وجہ یہ بھی

ہے کہ بعض گھرانوں میں بچوں کی پیدائش میں مناسب وقفہ نہ ہونے اور مسلسل بچوں کی پیدائش سے ماں لاغر، کمزور، تھکی ہوئی اور چڑ چڑی ہو جاتی ہے، عموماً ان گھروں میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ماں ان بچوں کو بے جا ڈانتی اور مارتی رہتی ہے اور صبح اٹھ کر منے کو دودھ اور تین بچوں کی فیڈر (دودھ کی بوتلیں) بھرنا............ اور منے کے ابا کو ناشتہ اور گھر کی ہانڈی کا جھگڑا نپٹانا...... کہیں اس میں کوسنے اور بد عائیں، کہیں اپنی ذات کو کوسنا، کہیں غصہ میں شوہر ہی کو کسی وقت کہہ دینا کہ ذرا آپ بھی تو فلانے کو سنبھال لیں بس خالی بولنا آتا ہے ......اور کوئی کام نہیں۔

بچوں کی تربیت کا دور دور تک نام ونشان نہیں، صبح سات بجے کے ناشتوں سے جو دن کی ابتداء ہوئی تو رات گیارہ بجے تک لنگر جاری...... ماں کا یہ حال کہ ایک بچہ ابھی شیر خوارگی کے زمانے ہی میں ہے، دوسرا حمل ٹھہرا، دودھ خراب ہوا، اس پچھلے کا دودھ چھڑایا اب وہ لاغر ہو رہا ہے، نندیں یا بہنیں، ہر وقت دیکھ نہیں سکتیں کہ جواب پاؤں چل رہا ہے وہ کہیں چولہے اور پکتی ہانڈی پر نہ جائے، ماں فوری دوسرے حمل کی وجہ سے بھاگ بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ اتر نہیں سکتی، اور دوسرا بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ اسی طرح کے بعض گھرانوں میں مذکورہ بالا پریشانیوں کی وجہ سے فرض نمازوں کا اہتمام، نہ تلاوت وذکر کی فکر، نہ دینی کتابوں کے مطالعہ کا وقت، نہ محلہ کی عورتوں کو پورے دین پر لانے کا غم، وغیرہ۔

لہٰذا اصل حقیقت پر غور کریں کہ صرف اولاد ہونا مطلوب نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کا وجود مقصود ہے، اس لیے ہم سب کی ذمہ داری ہے کہ بچوں کی صحیح تربیت کریں، پورا دن ذریعہ معاش کے لیے فکر کرنے کی بجائے ضرور کچھ وقت نکال کر ان کی دینی تربیت کریں، روزانہ ان کو بٹھا کر احادیث نبویہ سنائیں، اللہ تعالیٰ کی عظمت اور محبت اور فکر آخرت ان کے دلوں میں بٹھانے کی کوشش کریں۔

ماں باپ کی لڑائی کے بچوں پر بُرے اثرات

بچے کو دین سے دور کرنے اور اس کو جاہل اور نفسیاتی مریض بنانے کے اہم اسباب میں سے ماں باپ کے درمیان لڑائی جھگڑا اور باہمی نزاع واختلاف ہے۔ چنانچہ جب بچہ

گھر میں آنکھیں کھولتا ہے اور اپنی آنکھوں کے سامنے لڑائی جھگڑا دیکھتا ہے تو لازمی طور سے وہ گھر کی اس تاریک فضا سے دور ہونا چاہتا ہے، اور آفت زدہ خاندان کے دائرہ سے دور بھاگنا چاہتا ہے تا کہ اپنے من پسند دوستوں کے ساتھ اپنا وقت گزارے، اور فراغت کے اوقات ان کی رفاقت میں بسر کرے، یہ دوست اگر گندے اخلاق والے گھٹیا قسم کے لوگ ہوتے ہیں تو یہ بچہ بھی ان کے ساتھ خراب ہوتا چلا جاتا ہے اور بری عادتیں اور گندے اخلاق اختیار کر لیتا ہے، بلکہ وہ لازمی طور منحرف ہو جاتا ہے اور مجرم بن جاتا ہے اور اس طرح ملک وقوم کے لئے خطرہ کی نشانی بن جاتا ہے۔

اسلام نے اپنے پر حکمت اور ہمیشہ ہمیشہ باقی و برقرار رہنے والے اصول وقواعد کے ذریعے نکاح کے خواہش مند مرد کے لئے بیوی کے انتخاب واختیار کرنے میں صحیح راستہ متعین کیا، اور اسی طرح لڑکی کے اولیاء اور سرپرستوں کی، لڑکی کے لیے شوہر کے اختیار کرنے میں صحیح اور اعلیٰ ترین رہنمائی فرمائی، جس کا بنیادی مقصد ہی یہ ہے کہ میاں بیوی میں الفت ومحبت اور ایک دوسرے سے مفاہمت اور باہمی تعاون کی فضا پیدا ہو اور اس کا نتیجہ یہ نکلے کہ میاں بیوی ان ازدواجی پریشانیوں اور لڑائی جھگڑوں سے بچ جائیں جو عام طور سے میاں بیوی میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

طلاق کے بُرے اثرات

وہ نبیادی عوامل جو عام طور سے بچہ کے انحراف اور خراب ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں طلاق اور اسکے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات ہیں جس کی وجہ سے دونوں خاندانوں میں اختلاف وافتراق کی بنیاد پڑ جاتی ہے۔

وہ متفق علیہ اور مشاہدا مور جن میں کوئی بھی دو آدمیوں کا اختلاف نہیں ان میں سے یہ بھی ہے کہ بچہ جب دنیا میں آنکھ کھولتا ہے اور اس پر شفقت کرنے والی ماں اور اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے اور ضروریات پوری کرنے والا باپ نہیں ہوتا تو وہ لازمی طور سے جرائم اور برائیوں کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اس میں فساد وانحراف نشوونما پاتا رہتا ہے، یہ

صورت حال اس وقت اور زیادہ خراب ہو جاتی ہے جب مطلقہ عورت دوسرے خاوند سے شادی کر لیتی ہے تو عام طور سے اولاد خراب اور ضائع ہو جاتی ہے۔

طلاق کے بعد اس پریشانی کو ماں کی غربت اور پیچیدہ بنا دیتی ہے اس لئے ایسی صورت حال میں مطلقہ عورت کام کاج کے لئے گھر سے نکلنے پر مجبور ہوتی ہے، وہ گھر کو چھوڑ کر کام کرنے چلی جاتی ہے اور چھوٹے بچے بے یارو مددگار ادھر ادھر پھرتے ہیں، حوادثات ایام اور شب و روز کے فتنے ان کو کھلونا بنا لیتے ہیں، نہ کوئی ان کا دیکھ بھال کرنے والا ہوتا ہے نہ نگہداشت کرنے والا، اب آپ ہی بتایئے کہ ایسی اولاد سے آپ کیا توقع رکھتے ہیں جنہیں نہ باپ کی محبت میسر ہو نہ اس کی نگرانی و نگہداشت...... نہ ماں کا پیار ملا نہ اس کی توجہ اور ہمدردیاں۔

ہم ان سے ایسی صورت حال میں کیا توقع کر سکتے ہیں جب وہ اپنے پاس پیٹ بھر روٹی، بدن ڈھانپنے کو کپڑا اور سر چھپانے اور راحت و آرام کے لیے جھونپڑا بھی نہیں پاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسی صورت میں ہم ان سے آوارگی اور خراب ہونے کی توقع کر سکتے ہیں اور جرائم اور آوارگی سے بچنے کی اسی سے امید کر سکتے ہیں جس پر اللہ تعالیٰ رحم فرمائے اور ایسے لوگ درحقیقت کم ہی ملتے ہیں۔ مذہب بنیادی احکامات میں میاں بیوی میں سے ہر ایک کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے اپنے فرائض و واجبات کو پورا کرے اور ایک دوسرے کے حقوق کو ادا کرے، تاکہ ایسی صورت حال پیدا نہ ہو جس کا انجام آخر کار برا اور قابل ملامت ہو۔

ان حقوق میں سے شوہر کے ذمے بیوی بچوں کو نان نفقہ کی ذمہ داری کا پورا کرنا بھی ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”وعلى المولودِ له رزقهن و كسوتهن بالمعروفِ (البقرة:۲۳۳) (اور لڑکے والے یعنی باپ پر ہے کھانا اور کپڑا ان عورتوں کا دستور کے موافق۔)

امام مسلم رحمہ اللہ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

”عورتوں کے سلسلہ میں خدا سے ڈرو، اس لیے کہ تم نے انہیں اللہ کے امان کے ذریعہ حاصل کیا ہے اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلمہ کے ذریعہ حلال کیا ہے تم پر ان کے

نان ونفقہ اور کپڑے کی دستور کے موافق ذمہ داری ہے۔''

انہیں حقوق میں سے گھر کے معاملات میں شوہر کا بیوی سے مشورہ کرنا بھی داخل ہے اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

''آمروا النساء فی بناتھن'' (ابو داؤد)

(عورتوں سے ان کی بچیوں کے بارے میں مشورہ کرلیا کرو۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑکیوں کی شادی سے قبل ان کی ماؤں سے اجازت لے لیا کرو اور مشورہ کرلیا کرو۔

انہیں حقوق میں یہ بھی ہے کہ شوہر بیوی کی بعض کمزوریوں اور عیوب سے درگزر کرے اور خصوصاً اگر اس میں کچھ ایسی خوبیاں اور اوصاف پائے جاتے ہوں جو ان کمزوریوں اور عیوب کی تلافی کرتے ہوں۔ امام مسلمؒ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان روایت کرتے ہیں:

''کوئی مومن کسی مومن عورت سے بغض نہ رکھے، اس لیے کہ اگر اس کی کوئی بات ناپسند ہوگی تو اس کے بدلے دوسری پسند ہوگی۔''

ان حقوق میں سے مرد کا بیوی کے ساتھ ہنسی خوشی وقت گزارنا اور اس سے ملاطفت اور دل لگی کرنا بھی ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اور ان عورتوں کے ساتھ اچھی طرح سے رہو، پھر اگر وہ تم کو نہ بھائیں تو شاید ایک چیز تم کو پسند نہ آئے اور اللہ نے اس میں بہت خیر خوبی رکھی ہو۔'' (النساء)

امام ابن ماجہ اور امام حاکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک نقل کرتے ہیں: ''تم میں سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہو اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ تم سب سے بہتر ہوں''۔

امام بخاریؒ و مسلمؒ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عائشہؓ کو وہ کھیل دکھاتے تھے جو مسجد کے میدان کے سامنے ہو رہا ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ہتھیلی دروازہ پر رکھ لیا کرتے تھے اور ہاتھ دراز کرلیا کرتے تھے، اور حضرت عائشہؓ اپنا

چہرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے کاندھے پر رکھ دیا کرتی تھیں۔

ایک متفق علیہ روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''مومنوں میں سب سے کامل ایمان لانے والا وہ شخص ہے جو سب سے بہتر اخلاق والا ہو اور اپنے گھر والوں کے ساتھ نرمی اور اچھا برتاؤ کرنے والا ہو''۔

حضرت عمرؓ جیسے سخت گیر، ارادے کے پختہ اور فیصلے کے پکے شخص فرمایا کرتے تھے کہ:'' مرد کو اپنی بیوی کے ساتھ انس اور نرم مزاج ہونے کے اعتبار سے بچہ کی طرح ہونا چاہئے، ہاں جب لوگوں کے ساتھ ہو تو بھرپور آدمی بن جانا چاہئے۔''

ان حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ نبی کریم ﷺ کی اقتداء میں گھر کے کام میں مرد کو بیوی کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔ چنانچہ طبرانی وغیرہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ نبی کریم ﷺ گھر میں کیا کرتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا:'' جیسے تم لوگ کرتے ہو یہ چیز ادھر سے اٹھا کر ادھر رکھ دی، بے جگہ چیز جگہ پر رکھ دی، گھر والوں کا کام کر دیا، ان کے لیے گوشت کاٹ دیا، گھر کو جھاڑ پونچھ دیا، خادم کا ہاتھ بٹالیا۔''

یہ وہ اہم حقوق ہیں جنہیں اسلام نے میاں بیوی میں سے ہر ایک پر لازم کیا ہے اور یہ درحقیقت واقعی اور عادلانہ امور ہیں، اگر میاں بیوی میں سے ہر ایک ان کو پورا کرے تو بجائے اختلاف ولڑائی کے اتحاد ویگانگت وجود میں آئے گی اور بغض وناپسندیدگی کی جگہ الفت ومحبت لے لے گی، اور پورا خاندان خوشحالی اور محبت وسکون سے پُر بہتر سے بہتر زندگی گزارے گا۔ یہ قطعاً ناممکن ہوگا کہ کوئی بھی ایسی بات ہو جس سے خاندان والوں کی زندگی مکدر ہو یا جس سے میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے سے ناگواری گزرے یا تکلیف پہنچے۔

اور اگر مرد کی بداخلاقی یا عورت کے اخلاق کی خرابی کی وجہ سے آپس میں اتفاق واتحاد ناممکن ہو اور ان دونوں کا ایک ساتھ زندگی گزارنا مشکل ہو، بایں معنی کہ یکجا رہنے کے تمام طریقے اپنا لئے گئے ہوں، تو اب شوہر کو اختیار ہے کہ وہ طلاق کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔

۞۞۞

اسلام کا نظام طلاق

نکاح ایک ایسا بندھن اور عہد ہے، جو پوری زندگی کی رفاقت، غم گساری اور ہم نشینی کے لیے ہوتا ہے، جہاں تک ممکن ہو، اس بندھن کو ٹوٹنے سے بچایا جائے اور عہد کی تکمیل کی جائے۔لیکن اس حقیقت کا بھی انکار ممکن نہیں کہ ہر انسان اور ہر فرد بشر کا مزاج اور طبیعت الگ ہے، ہر ایک کے سوچنے کا انداز اور رہنے سہنے کا طرز جدا ہے، بعض لوگوں کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے کہ وہ اپنی طبیعت کے خلاف کسی بھی بات کو برداشت ہی نہیں کر پاتے ،اور معمولی معمولی باتوں پر تکرار اور جھگڑا شروع کر دیتے ہیں، یہ مزاج کسی عورت کا بھی ہوسکتا ہے اور کسی مرد کا بھی۔اسی لیے نکاح کرتے وقت اولیاء کو اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ ہم مزاج لڑکے اور لڑکی کا آپس میں رشتہ کریں، ورنہ بعد میں مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے کسی کا رشتہ ایسا ہو ہی گیا کہ میاں بیوی کا مزاج ہم آہنگ نہیں ہے،اور دونوں ایک دوسرے کو سامان راحت وسکون کی بجائے عذاب اور مصیبت محسوس کر رہے ہیں ،اور آپسی تعلقات کو بحال رکھنے کی تمام تدابیر ختم ہو چکی ہیں تو اب اس صورت میں دونوں کے درمیان جدائی کرادینا ہی بہتر ہے، تا کہ دوسرا نکاح کر کے دونوں سکون کی زندگی گذار سکیں۔

طلاق کے لغوی معنی

اسی جدائی کا نام طلاق ہے۔''طلاق'' عربی لفظ ہے، جس کے معنی اردو زبان میں کھولنے یا چھوڑ دینے کے ہیں اور اصطلاحِ شریعتِ اسلامیہ میں مرد کا اپنی عورت کو اپنے

نکاح سے خارج کر دینا ہے۔جس کی اجازت شریعت نے بدرجۂ مجبوری عطا کی ہے اور ایک ایسا جواز قرار دیا ہے جسے صرف اس وقت اختیار کیا جاسکتا ہے جب صلح کی تمام تدبیریں ناکام ہو جائیں اور اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہے کہ دونوں میاں بیوی علاحدگی اختیار کر لیں۔

طلاق کی شرعی حیثیت

اس جواز کی کیا حیثیت ہے،اس کا پتہ اس بات سے چلتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے''**ابغض المباحات**'' کہا ہے،یعنی ایسا امرِ مباح جو اللہ تعالیٰ کے ہاں سخت ناگوار اور انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

طلاق کب دی جائے

طلاق ایسی فضا میں دینا چاہیے جس میں اس کو ایذا بالباطل سے تعبیر نہ کیا جائے۔ قرآن حکیم میں ہے:

''فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا'' (النساء:۳۴)

(اور اگر فرمانبرداری اختیار کرلیں تو ایذا دہی کا بہانہ مت ڈھونڈو۔)

اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے لیے خواہ مخواہ اسباب و وجوہ تلاش نہیں کرنا چاہیے بلکہ کوشش کرنا چاہیے کہ حالات حتی الامکان سازگار رہیں اور میاں بیوی میں محبت وحسنِ سلوک کا ماحول ہمیشہ قائم رہے۔پھر اگر علیٰحدگی ناگزیر ہوجائے اور علاحدہ ہوجانے ہی میں دونوں کا بھلا اور راحت ہے تب طلاق کی نوبت آنا چاہیے،ورنہ بغیر کسی عذر شرعی وطبعی کے طلاق دینا ایذائے باطل کے تحت شمار ہوگا۔

پھر جس طرح مرد کے لیے ضروری ہے کہ بغیر حالات کی انتہائی ناسازگاری کے طلاق نہ دے،اسی طرح عورت کو بھی چاہیے کہ خواہ مخواہ طلاق کا مطالبہ کر کے اپنی دنیا وعقبیٰ خراب نہ کرے۔حدیث میں ہے:

ایما امرأۃ سألت زوجھا طلاقھا من غیر ما بأس لم ترح رائحۃ الجنۃ۔

(جو عورت بھی اپنے خاوند سے بغیر کسی تکلیف کے اور حقیقی شکایت کے طلاق کا مطالبہ کرے گی وہ جنت کی بو بھی نہیں سونگھ پائے گی۔)

واضح رہے کہ طلاق کی غرض صرف یہ ہے میاں بیوی کسی معقول وجہ سے ازدواجی رشتوں کو قائم نہیں رکھنا چاہتے، اس لیے ان میں اب جدائی ہورہی ہے تاکہ جو جہاں چاہے نکاح کرے، یہ بات بہرحال معاملہ کی ہے، اس لیے اس کو نہایت خوش اسلوبی سے معاملہ ہی کی سطح پر ادا کرنا چاہیے، بدمزگی، بدگمانی اور ایسی فضا پیدا نہ ہونے دینا چاہئے کہ جس سے ان دونوں میں کسی ایک کی شہرت خراب ہو، عزت پر داغ آئے اور مزید تلخیاں پیدا ہوں۔ اسی لیے شوہر کو چاہیے کہ ایسے وقت طلاق دے، جس میں عورت کو زیادہ عدت نہ گزارنی پڑے، اسی طرح ایک طلاق دے، تاکہ آئندہ اگر اتفاق کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو رجوع کا اختیار باقی رہے۔

عورت چوں کہ جذباتی اور کم فہم ہوتی ہے، حالات سے جلد متاثر ہو جاتی ہے، اس کے بالمقابل مرد معاملہ فہم، دوراندیش اور حالات سے مقابلہ کرنے والا ہوتا ہے، اس لیے شریعت اسلامیہ نے طلاق کا حق صرف مرد کو دیا ہے، کہ بہت سوچ سمجھ کر وہ اپنے اس اختیار کو استعمال کرے۔ عورت کو اگر اختیار دے دیا جاتا تو معمولی معمولی باتوں سے متاثر ہو کر وہ اپنے اس اختیار کو استعمال کرنے لگتی، اور نکاح و طلاق جو زندگی کے انتہائی اہم امور ہیں مزاق بن کر رہ جاتے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اسلام نے عورت کو مرد کے ہاتھوں میں مجبور محض بنا دیا ہے، اب وہ جس طرح چاہے اس پر ظلم و زیادتی کے پہاڑ توڑتا رہے اور وہ بیچاری پوری زندگی سسکتی اور ظلم سہتی رہے، اولا شریعت نے اسے خلع کا اختیار دیا ہے کہ مہر معاف کر کے یا کچھ مال وغیرہ دے کر شوہر کو طلاق پر راضی کر لے، لیکن اگر وہ اس پر بھی تیار نہیں ہوتا، اور ظلم و زیادتی سے بھی باز نہیں آتا تو ثانیاً اس کو اختیار ہے کہ دارالقضاء میں قاضی کے یہاں اپنے معاملے کو پیش کر دے، قاضی معاملے کی تحقیق کرے گا اور اگر واقعۃً شوہر ظالم ہے تو اسے مجبور کرے گا کہ وہ طلاق دیدے، اگر اس صورت میں بھی وہ طلاق نہیں دے گا، تو قاضی کو اختیار ہے کہ نکاح فسخ کر کے

عورت کو آزاد کردے اور اسے دوسرا نکاح کرنے کا اختیار دیدے۔

طلاق کا غلط استعمال

اللہ نہ کرے کہ مسلمان زوجین میں سے کسی کی زندگی میں طلاق کا ناپسندیدہ مرحلہ آئے۔ سب جانتے ہیں کہ یہ چیز کتنی ناپسندیدہ ہے کہ اگر اس کا غلط استعمال ہوگیا تو سوائے پچھتانے اور رونے کے کچھ حاصل نہیں۔ ہمارے معاشرہ میں اس وقت سب سے قبیح صورت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ شرعی معاملات ومسائل سے ناواقف لوگوں نے ''طلاق'' کو غصہ نکالنے کا ایک ذریعہ سمجھ لیا ہے، جہاں میاں بیوی میں کوئی اختلاف پیش آیا اور نوبت غصے اور اشتعال تک پہنچی، شوہر نے فوراً طلاق کے الفاظ زبان سے نکال دیے، حالانکہ ''طلاق'' کوئی گالی نہیں ہے جو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے دیدی جائے۔ یہ نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا وہ انتہائی اقدام ہے جس کے نتائج بڑے سنگین ہیں، اس سے صرف نکاح کا رشتہ ہی ختم نہیں ہوتا بلکہ خاندانی زندگی کے بہت سے مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں۔

طلاق کا اختیار کیوں

اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے اس نے طلاق کے بارے میں یہ سخت موقف تو اختیار نہیں کیا کہ نکاح کے بعد طلاق ہی نہ ہو، کیوں کہ میاں بیوی کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مرحلے پیش آجاتے ہیں جب دونوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ شرافت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں، ایسے موقع پر نکاح کے رشتے کو ان پر زبردستی تھوپے رکھنا دونوں کی زندگی کو عذاب بنا سکتا ہے۔

اس لیے اسلام نے طلاق کو ناجائز یا حرام تو قرار نہیں دیا اور نہ اس کے ایسے لگے بندھے اسباب متعین کئے جو علاحدگی کے معاملے میں میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں، لیکن اول تو آنحضرت ﷺ نے صاف صاف فرما دیا کہ مباح (جائز) چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے، دوسرے میاں بیوی کو ایسی

ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو طلاق کی نوبت کم سے کم آئے۔ تیسرے اگر طلاق کی نوبت آ ہی جائے تو اس کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس میں خرابیاں کم سے کم ہوں، آج اگر لوگ ان ہدایات اور احکام کو اچھی طرح سمجھ لیں اور ان پر عمل کریں تو نہ جانے کتنے گھریلو تنازعات اور خاندانی مسائل خودبخود حل ہو جائیں۔

طلاق سے پہلے کے مراحل

جہاں تک ان ہدایات کا تعلق ہے جو طلاق کے سد باب کے لیے دی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی ہدایت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دی ہے کہ:

''اگر کسی شوہر کو اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے، تو اسے اس کی اچھی باتوں پر بھی غور کرنا چاہئے''۔

مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بے عیب نہیں ہوتا اگر کسی میں ایک خرابی ہے تو دس اچھائیاں بھی ہوسکتی ہیں، ایک خرابی کو لے بیٹھنا اور دس اچھائیوں سے آنکھ بند کر لینا انصاف کے بھی خلاف ہے اور اس سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔

بلکہ قرآن کریم نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ''اگر تمہیں اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے تو (یہ سوچو) کہ شاید تم جس چیز کو برا سمجھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لیے کوئی بڑی بھلائی رکھی ہو''۔ (سورۂ نساء)

دوسری ہدایت قرآن کریم نے یہ دی ہے کہ جب میاں بیوی آپس میں اپنے اختلافات طے نہ کر سکیں اور نرم و گرم ہر طریقہ آزمانے کے بعد بھی تنازع برقرار رہے تو فوراً علاحدگی کا فیصلہ کرنے کے بجائے دونوں کے خاندان والے ایک ایک شخص کو ثالث بنائیں اور یہ دونوں کے نمائندے آپس میں ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لے کر میاں بیوی کے درمیان تنازع ختم کرانے کی کوشش کریں، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر یہ دونوں نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا۔ (سورۂ نساء)

طلاق کا وقت

لیکن اگر یہ تمام کوششیں بالکل ناکام ہو جائیں اور طلاق ہی کا فیصلہ کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے کہ شوہر اس کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرے، مناسب وقت کی تشریح آنحضرت نے یہ فرمائی ہے کہ طلاق اس وقت دی جائے جب بیوی طہر کی حالت میں ہو یعنی حیض سے فارغ ہو چکی ہو اور فراغت کے بعد سے میاں بیوی کا ملان نہ ہوا ہو، لہٰذا اگر عورت طہر کی حالت میں نہ ہو تو ایسے وقت طلاق دینا شرعاً گناہ ہے، نیز اگر طہر ایسا ہو کہ اس میں میاں بیوی کے درمیان ازدواجی قربت ہو چکی ہو، تب بھی طلاق دینا شرعاً جائز نہیں، ایسی صورت میں طلاق دینے کے لئے شوہر کو اگلے مہینے تک انتظار کرنا چاہئے۔

اس طریقہ کار میں یوں تو بہت سی مصلحتیں ہیں لیکن ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ طلاق کسی وقت منافرت یا جھگڑے کا نتیجہ نہ ہو، شوہر کو مناسب وقت کے انتظار کا حکم اس لیے بھی دیا گیا ہے کہ اس عرصے میں وہ تمام حالات پر اچھی طرح غور کر لے اور جس طرح نکاح سوچ سمجھ کر ہوا تھا، اسی طرح طلاق بھی سوچ سمجھ کر ہی دی جائے، چنانچہ عین ممکن ہے کہ اس انتظار کے نتیجے میں دونوں کی رائے بدل جائے، حالات بہتر ہو جائیں اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

طلاق کا درست طریقہ

پھر اگر مناسب وقت آ جانے پر بھی طلاق کا ارادہ برقرار رہے تو شریعت نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ بتایا ہے کہ شوہر صرف ایک طلاق دے کر خاموش ہو جائے، اس طرح ایک رجعی طلاق ہو جائے گی جس کا حکم یہ ہے کہ عدت گزر جانے پر نکاح کا رشتہ شرافت کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائے گا اور دونوں اپنے اپنے مستقبل کے لیے کوئی فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

اس طریقے میں فائدہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اگر مرد کو اپنی غلطی کا احساس

ہوا اور وہ یہ سمجھے کہ حالات اب بہتر ہو سکتے ہیں، تو وہ عدت کے دوران اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کرسکتا ہے، جس کے لیے زبان سے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ میں نے طلاق سے رجوع کرلیا، اس طرح نکاح کا رشتہ خود بخود تازہ ہو جائے گا اور اگر عدت بھی گزر گئی اور دونوں میاں بیوی یہ سمجھیں کہ اب انہوں نے سبق سیکھ لیا ہے اور آئندہ وہ مناسب طریقے پر زندگی گزار سکتے ہیں تو ان کے لیے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ باہمی رضا مندی سے دوبارہ از سرِ نو نکاح کرلیں (جس کے لیے نیا ایجاب وقبول گواہ اور مہر سب ضروری ہے)۔

اگر مذکورہ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میاں بیوی نے پھر سے نکاح کا رشتہ تازہ کرلیا ہو اور پھر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تنازع کھڑا ہو جائے تب بھی دوسری طلاق دینے میں جلدی نہ کرنی چاہئے بلکہ ان تمام ہدایات پر عمل کرنا چاہئے جو اوپر بیان ہوئیں، ان تمام ہدایات پر عمل کے باوجود اگر شوہر پھر طلاق ہی کا فیصلہ کرے تو اس مرتبہ بھی ایک ہی طلاق دینی چاہئے۔

اب مجموعی طور پر دو طلاق ہو جائیں گی، لیکن معاملہ اس کے باوجود میاں بیوی کے ہاتھ میں رہے گا۔ یعنی عدت کے دوران شوہر پھر رجوع کرسکتا ہے اور عدت گزارنے کے بعد دونوں باہمی رضا مندی سے تیسری بار پھر نکاح کر سکتے ہیں۔

یہ ہے طلاق کا وہ طریقہ جو قرآن وحدیث میں بیان ہوا ہے اور اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ قرآن وسنت نے نکاح کے رشتے کو برقرار رکھنے اور اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لیے درجہ بہ درجہ کتنے راستے رکھے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص ان تمام درجوں کو پھلانگ جائے تو پھر نکاح وطلاق آنکھ مچولی کا کوئی کھیل نہیں ہے جو غیر محدود زمانے تک جاری رکھا جائے، لہٰذا جب تیسری طلاق دیدی جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اب نکاح کو تازہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں، اب نہ شوہر رجوع کرسکتا ہے نہ میاں بیوی باہمی رضا مندی سے نیا نکاح کر سکتے ہیں اب دونوں کو علاحدہ ہونا ہی پڑے گا۔

معاشرتی غلط فہمی

ہمارے معاشرے میں طلاق کے بارے میں انتہائی سنگین غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ تین سے کم طلاقوں کو طلاق ہی نہیں سمجھا جاتا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا لفظ صرف ایک یا دو مرتبہ کہا جائے تو اس سے طلاق ہی نہیں ہوتی، چنانچہ جب کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے تو لوگ تین طلاقوں سے کم پر بس نہیں کرتے اور کم سے کم تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا طلاق صرف ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہو جاتی ہے۔

اولاً تو کوشش یہ ہو کہ طلاق تک ہرگز ہرگز بات نہ پہنچے اور کبھی حالات کا رخ اس جانب ہی مڑ چلا ہو کہ سوائے اس کے اور کوئی راستہ ہی نہ ہو تو جلد بازی یا جوش سے کوئی قدم نہ اٹھایا جائے، بلکہ خاندان کے بڑوں، اور علماء حضرات سے ضرور بالضرور رہنمائی حاصل کی جائے۔ پھر اگر طلاق دینا ہی پڑے تو صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہا یا لکھا جائے اس طرح طلاق تو ہو جاتی ہے، لیکن اگر بعد میں سوچ سمجھ کر نکاح کا رشتہ تازہ کرنا ہو تو اس کے دروازے کسی کے نزدیک مکمل طور پر بند نہیں ہوتے۔ طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے۔

ایک ساتھ تین طلاق

ایک ساتھ تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا شرعاً گناہ ہے۔ حنفی، شافعی، مالکی، اور حنبلی چاروں فقہی مکاتب فکر کے نزدیک اس گناہ کی ایک سزا یہ ہے کہ اس کے بعد رجوع یا نئے نکاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا اور جو لوگ ان فقہی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اکثر تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

لہٰذا طلاق کے معاملے میں سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے طلاق نہیں ہوتی اور یہ بات اچھی طرح لوگوں میں عام کرنی ضروری ہے کہ طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک

مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اگر عدت کے دوران شوہر کے رجوع کا حق ختم کرنا مقصود ہو تو ایک طلاق ''بائن'' دی جائے یعنی طلاق کے ساتھ بائن کا لفظ بھی ملا لیا جائے تو شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کرنے کا حق نہیں رہے گا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں میاں بیوی جب چاہیں نیا نکاح کر سکیں گے۔ یہ بات کہ طلاق کا احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دی جائے پوری امت میں مسلم ہے اور اس میں کسی مکتبِ فکر کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

طلاق میں عورت کی رضامندی لازم کیوں نہیں؟

سوال:

رہا یہ سوال کہ جب نکاح مرد اور عورت کی رضامندی سے ہوتا ہے، تو طلاق میں عورت کی رضامندی کیوں شرط نہیں، اور یک طرفہ مرد کو طلاق دینے کا اختیار کیوں دے دیا گیا ہے؟ حالاں کہ وہ بھی ایک انسان اور عاقل بالغ ہے، اس کو شوہر کے ہاتھ میں کھلونا کیوں بنا دیا گیا ہے؟ مساوات کا تقاضا تو یہ ہے کہ بیوی کی رضا کے بغیر طلاق واقع ہی نہ ہو، یا پھر جس طرح شوہر کو طلاق دینے کا اختیار دیا گیا ہے، اسی طرح عورت کو بھی یہ اختیار دیا جائے کہ بوقت ضرورت وہ بھی اپنے شوہر کو طلاق دے کر اس سے نجات حاصل کر لے؟

جواب:

اس نامعقول اعتراض کا جواب یہ ہے کہ معترضین کے سامنے نہ نکاح وطلاق کا شرعی مفہوم ہے، نہ اس کی نوعیت اور معنویت، اگر وہ ان کا صحیح مفہوم کچھ بھی سمجھے ہوئے ہوتے تو ایسا بودا اعتراض نہ کرتے، اس لئے کہ میاں و بیوی کی مساوات کے افسانے محض نافہمیٔ حقیقت پر مبنی ہیں، جس میں حقیقت کا کوئی نشان نہیں۔ معترضین نے نکاح کو دنیا کے عام رسمی سمجھوتوں اور باہمی معاہدوں پر قیاس کر کے سمجھوتوں کے آثار واحکام نکاح پر بھی لا درکھے ہیں، حالانکہ ان دونوں میں نہ صرف یہ کہ بحیثیت مجموعی ہی کوئی قدرِ مشترک نہیں بلکہ ان کے

اجزائے ترکیبی تک میں بھی کسی اشتراک کا نشان نہیں۔ان لوگوں نے مساوات کا خوشنما اور رائج الوقت عنوان دیکھ کر موقع ومحل سمجھے بغیر بیوی وشوہر کے گلے میں بھی یہ سنہرا ہار ڈال دیا، خواہ انجام کاران کے لئے یہ طوق ہی کیوں نہ ثابت ہو۔

نکاح ایک شرعی عنوان ہے، جس سے مرد وعورت کا رشتۂ زوجیت قائم ہوجاتا ہے اور ایسے ہی طلاق بھی ایک شرعی اصطلاح ہے، جس سے یہ رشتہ منقطع ہوجاتا ہے، لیکن خود اس رشتہ کی نوعیت اور اسکے حدود وشرائط کیا ہیں؟ سو ظاہر ہے کہ وہ بھی اسی واضع قانون سے پوچھی جائیں گی جس نے یہ الفاظ وضع کئے ہیں، نہ کہ عوام الناس سے کہ یہ اصطلاح ان جمہور کی وضع کردہ نہیں، بلکہ خدائے برحق کی طرف سے نازل شدہ ہے۔

نکاح کے عنوان سے شریعت الٰہی کی روشنی میں جو رشتۂ زوجیت قائم ہوتا ہے، اس کی نوعیت صرف اتنی ہے کہ عورت قانون خداوندی کے تحت اپنا نفس مرد کے حوالہ کردینے کی رضا دیتی ہے اور مرد اس الٰہی قانون کے تحت اس حوالگی اور سپردگی کو قبول کر کے عورت کو اپنی کفالت اور ذمہ داری میں لے لیتا ہے، جس سے اسی آن مرد پر تو عورت کا نان ونفقہ، رہائش، حقوق رہائش وآسائش اور عورت کی عام ضروریات زندگی نیز مہر وغیرہ لازم ہوجاتے ہیں، اور عورت پر اس حوالگی نفس سے مرد کے تمام جنسی انتفاعات، مرد کے اسرار کی حفاظت، اس کے مال ومتاع کے معاملہ میں امانت ودیانت اور راست بازی سے اس کی منشاء کی پاسداری اور اطاعت شعاری لازم ہوجاتی ہے۔

اس لئے عورت اگر اپنے کو مرد کے حوالہ کرے تو ”وَهَبْتُ نَفسِي لَکَ“ (میں نے اپنا نفس آپ کو ہبہ کیا) کہے گی، اور مرد ”قَبِلتُ“ (میں نے قبول کیا) کہے گا، جس سے مرد عورت کے مال یا جائیداد وغیرہ کو قبول نہیں کرتا، بلکہ خود عورت کو قبول کرتا ہے جس نے اپنا نفس اسے ہبہ کیا ہے۔مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کو اپنا نفس نہیں دیتا، بلکہ نان ونفقہ اور ضروریات زندگی دیتا ہے اور اس کا کفیل بن جاتا ہے اور عورت مرد کو اپنا مال ومتاع یا اس کی ضروریات زندگی نہیں دیتی، بلکہ عورت صرف اپنا نفس دیتی ہے، اس کی کفیل نہیں بنتی، بلکہ خود اس کی کفالت وذمہ داری میں آتی ہے۔پس اس عقد اور معاملے میں ایک فریق نفس

چاہتا ہے اور ایک فریق مال وضروریات زندگی وغیرہ۔

اس سے یہ حقیقت بھی نمایاں ہوجاتی ہے کہ جب مرد، عورت کو قبول کر کے اس کے تمام مصارف کا کفیل ہو جاتا ہے تو مالک قبول مرد ہی ہوا نہ کہ عورت، کہ عورت نے قبول ہی کیا کیا تھا جو اسے مالک قبول کہا جائے؟ اس نے تو صرف اپنا نفس اپنی رضا سے خود ہی مرد کے حوالہ کیا تھا، جس کا نام قبول نہیں کہ وہ صاحب قبول بنتی یا اس کے اخراجات کی ذمہ دار ہوتی جو قبولیت کا قدرتی تقاضا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ صاحب قبول مرد ہی ہے بلکہ نکاح کی تشکیل میں اصل چیز ہی قبول ہے جو مرد کے ہاتھ میں ہے، وہ قبول نہ کرے تو عورت لاکھ بار بھی ''وَهَبْتُ'' کہے، نکاح منعقد نہیں ہوگا۔

اس لئے اگر یہ کہا جائے کہ مالکِ نکاح صرف مالکِ قبول ہے، نہ کہ صاحبِ ہبہ یا صاحبِ رضا، تو یہ ایک بدیہی حقیقت ہوگی، اور جب مالکِ قبول مرد ہے، عورت نہیں، تو نتیجہ صاف ہے کہ مالکِ نکاح بھی مرد ہے عورت نہیں۔

ممکن ہے اس موقعہ پر کوئی یہ کہے کہ اگر مرد ''قَبِلْتُ'' کی بجائے عورت سے یہ کہے کہ میں نے اپنے کو تیرے نکاح میں دے دیا ہے اور عورت اپنی رضا اور حوالگئ نفس کی اصطلاح بدل کر مرد سے یہ کہے کہ میں نے تجھے قبول کر لیا ہے، تب بھی نکاح منعقد ہو جائے گا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عورت بھی صاحبِ قبول اور مالکِ نکاح بن سکتی ہے، حالاں کہ صاحبِ قبول اور مالک نکاح قرآنی نصوص سے صرف مرد ہی کو ثابت کیا جا تا رہا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ان لفظوں کے بدلنے سے زن وشوہر کی ان حیثیتوں اور منصبوں میں کوئی فرق نہیں پڑسکتا جو قرآن نے متعین کر دی ہیں، نہ مرد کی مردانگی ختم ہوگی نہ عورت کی نسوانیت، اور نہ ہی مرد کا منصبِ قوامیت باطل ہوگا اور نہ عورت کا منصبِ اطاعت۔ پس ان بدلے ہوئے الفاظ کو مرد وعورت کی لاعلمی اور سادہ لوحی پر محمول کر کے اصل ضابطۂ فطرت ہی پر برقرار رکھا جائے گا کہ مرد بدستور صاحبِ قبول اور مالکِ نکاح ہے اور عورت اسی طرح صاحبِ رضا وتسلیم ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ جیسے کوئی مرد حماقت سے یہ اعلان کرے کہ میں مرد نہیں عورت ہوں اور عورت کہے کہ میں عورت نہیں مرد ہوں، تو محض ان کے بدلے

ہوئے الفاظ سے ان دونوں کی حقیقت نہیں بدل جائے گی ۔ مرد مرد ہی رہے گا اور عورت عورت ہی رہے گی ۔

خلاصہ یہ کہ جب مرد ہی صاحبِ قبول اور مالکِ نکاح ہے تو وہی مالکِ ردِّ قبول (یعنی مالک طلاق) بھی ہوسکتا ہے، کیونکہ مرد کے قبول کا تعلق عورت کے نفس سے تھا کہ اسے ہی مرد نے قبول کیا تھا، تو فسخِ قبول یعنی عورت کو قبول سے نکال دینے کا تعلق بھی قدرتاً مرد ہی سے ہوسکتا ہے ۔ جس کا حاصل طلاق ہے ۔

پس معلوم ہوا کہ مالکِ طلاق بھی مرد ہی ہے نہ کہ عورت، اور جس طرح عقدۂ نکاح مرد کے ہاتھ میں تھا اسی طرح عقدۂ طلاق بھی مرد ہی کے ہاتھ میں رہے گا، نہ کہ عورت کے ہاتھ میں، کیونکہ یہ ایک موٹی سی بات ہے کہ رد وہی چیز کی جاسکتی ہے جو قبول کر کے قبضے میں لے لی گئی ہو ۔

جب مرد نے عورت کو قبول کر کے اپنی کفالت اور قبضہ میں لے لیا تو اسے رد یا مسترد تو وہی کر سکے گا جس نے قبضہ میں لیا ہے، اور وہ مرد ہے نہ کہ عورت ۔ جس نے مرد کو قبضہ یا کفالت میں لیا ہی نہ تھا تو وہ مسترد کس چیز کو کرے گی ؟ کہ حقِ طلاق کی مستحق ہو ۔ یعنی عورت نے مرد پر قبضہ ہی کب کیا تھا کہ وہ اس قبضہ کو ختم کرتی، وہ تو اپنا نفس مرد کو ہبہ کر کے خود اپنے نفس سے بھی خالی ہاتھ ہوگئی تھی، تو وہ رد کس چیز کو کرتی کہ اسے صاحبِ طلاق کہا جائے ؟ جب کہ طلاق سے نفس ہی تو رد کیا جاتا ہے نہ کہ کچھ اور، تو کیا وہ اس چیز کو رد کرے گی جو اس کے ہاتھ ہی میں نہیں تھی یعنی مرد کا نفس ؟

پھر جیسے ابتداءً قبل از نکاح عورت کی حوالگیٔ نفس اور رضامندی کے باوجود اس کا رد وقبول مرد ہی کے ہاتھ میں تھا کہ عورت کو قبول کرے یا نہ کرے، جس میں عورت کا دخل نہیں، ایسے ہی انتہاءً بھی فسخِ قبول یعنی طلاق بھی قدرتاً اسی کے ہاتھ میں ہوگی کہ وہ اپنے قبول کو باقی رکھے یا بذریعۂ طلاق ختم کر دے، عورت کا اس میں بھی دخل نہ ہوگا اور نہ ہی اس کی رضاء وعدمِ رضاء اس میں معتبر ہوگی ۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ طلاق، آثارِ نکاح میں سے ہے، خود کوئی مستقل نئی چیز

نہیں ہے کہ جس میں کوئی استقلالی شان ہو، بلکہ وہ نکاح ہی کے تابع ہو کر چلتی ہے۔ نکاح نہ ہو تو طلاق کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔ غیر منکوحہ کو کون طلاق دے سکتا ہے؟ غرض طلاق تابعِ نکاح ہو کر عقدہ بنتی ہے، خود سے کوئی مستقل عقد یا عقدہ نہیں۔ اس لئے جس ہاتھ میں نکاح کی باگ ڈور ہوگی، اسی ہاتھ میں آثار نکاح یا نکاح کے تابع چیزوں کی باگ ڈور بھی ہوگی اور وہ طلاق ہے پس جس ہاتھ سے نکاح نکل جائے یا ہاتھ میں آنے ہی نہ پائے، یا آہی نہ سکے تو اس ہاتھ سے طلاق بھی نکل جائے گی یا آہی نہ سکے۔ اس لئے یہ کہنا کہ جب نکاح کے انعقاد میں عورت دخیل ہے تو طلاق کے حق میں وہ کیوں دخیل نہ ہوگی، انتہائی بے خبری اور لغویت پر مبنی ہے۔

عورت انعقاد نکاح ہی میں کب دخیل تھی کہ فسخ نکاح میں اسے دخیل مانا جائے، اور عقدۂ نکاح کب اس کے ہاتھ میں تھا کہ عقدۂ طلاق اس کے ہاتھ میں ہو؟ وہ صرف حوالگئ نفس کی رضاء کی حد تک ذمہ دار تھی نہ کہ قبول اور عدم قبول نکاح یا بقائے قبول، کہ یہ اس کے دائرہ کی چیز نہیں ہے۔

رہا یہ اعتراض کہ عورت کو اختیارِ طلاق نہ دے کر شوہر کے ہاتھ میں مجبور محض بنا دیا گیا ہے، تو یہ اعتراض ہی سرے سے غلط ہے اور اصل مسئلے سے عدم واقفیت پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ شریعت نے شوہر کے ظالم ہونے اور عورت کے حقوق ادا نہ کرنے کی صورت میں عورت کو خلع یا بذریعہ قاضی نکاح فسخ کرانے کا اختیار دیا ہے، مجبور محض نہیں بنایا ہے۔

علاوہ ازیں خلقی، عقلی اور معاشرتی رہن سہن کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تب بھی حقِ طلاق، عورت پر کسی طرح منطبق نہیں ہوسکتا اور اگر زبردستی منطبق کر دیا جائے تو طرح طرح کے مفاسد کا ایک نیا دروازہ کھل جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ عورت کی جنس کا ناقص العقل اور ناقص الدین ہونا شرعی، خلقی اور معاشرتی طور پر ایک مسلمہ حقیقت ہے، جس کا انکار کوئی کوتاہ عقل وعلم ہی کرسکتا ہے۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ نقصانِ عقل کا اثر فکر ونظر کی کوتاہی، ذہنی تنگی اور ضد کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا ہے، اور نقصان دین کا اثر جذباتیت، بے صبری، عدم تحمل اور ازخود رفتگی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا، مشاہدہ ہے کہ زن وشوہر میں اگر جھگڑا

ہوتا ہے مرد تو حجتیں پیش کر کے اپنے کو حق بجانب ثابت کرنیکی کوشش کرتا ہے اور عورت جذبا ت سے مغلوب ہو کر وہی اپنی مرغ کی ایک ٹانگ ہانکتی رہتی ہے۔

مرد وعورت میں خلقی وطبعی فرق: جدید سائنس کی روشنی میں

مرد کے مقابلے میں عورت کی خلقی اور طبعی کمزوری کے حوالے سے جدید سائنس کی یہ تحقیق ملاحظہ ہو:

طول:

مرد اور عورت کے طول میں اوسطاً ۱۲ رسینٹی میٹر کا فرق ہے۔

جسامت: مرد کا ثقل جسم کا اوسط	:	سینتالیس کیلو
عورت کا ثقل جسم کا اوسط	:	ساڑھے بیالیس کیلو
فرق	:	ساڑھے چار کیلو

حرارتِ غریزی:

کاربونک ایسڈ کے جلانے کا فرق

مرد ایک گھنٹہ میں تقریباً ۱۱ رڈرام جلاتا ہے۔

عورت ایک گھنٹہ میں تقریباً ۶ رڈرام جلاتی ہے۔

فرق تقریباً : ۵ رڈرام

دماغ:

مرد	عورت
مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط	عورت کے دماغ کے وزن کا اوسط
ساڑھے انچاس اوقیہ	چوالیس اوقیہ
۲۸۷ ر دماغوں کے وزن کے نتیجہ میں سب سے وزنی دماغ ۶۵ راوقیہ اور سب سے چھوٹا ۳۴ ۱۳ روقیہ کا ثابت ہوا۔	۲۹۱ ر دماغوں کے وزن کے نتیجہ میں سب سے وزنی دماغ ۵۴ راوقیہ اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ راوقیہ کا نکلا۔

نوٹ:

بیوقوفوں کے دماغ کا وزن ۲۳/اوقیہ سے کسی حالت میں زیادہ ثابت نہیں ہوا۔
مسلم داناؤں کے دماغ کا وزن ۶۰/اوقیہ سے بھی متجاوز ثابت ہوا۔

قلب:

عورت کا قلب مرد کے قلب سے ۶۰/ڈرام چھوٹا اور خفیف ہوتا ہے۔

عضلات:

عورت کے عضلات اس قدر ضعیف ہیں کہ اگر ان کی طبعی قوت کے تین حصے کیے جائیں تو دو حصے مرد میں اور ایک حصہ عورت میں ثابت ہوگی، یہی نسبت ان کی سرعت اور ضبط میں بھی ہے۔

حواس خمسہ:

قوت شامہ: (الف) عورت ایک خاص فاصلہ سے عطر، لیموں کی خوشبو محسوس نہیں کرسکتی اور مرد اس درجہ کی خوشبو کو آسانی سے محسوس کر لیتا ہے، جس سے دو چند مقدار کی خوشبو سے عورت کو احساس ہوسکتا ہے۔

(ب) عورت ہلکے سے ''براسک ایسڈ'' کی بو ۲۰۰۰۰/۱ کی نسبت سے اور مرد ۱۰۰۰۰۰/۱ سے محسوس کرسکتا ہے، جو ضعف کی بیّن دلیل ہے۔

ذوق اور سمع: اسی فرق کی وجہ سے طعام کی عمدگی اور بدمزگی کے پہچاننے والے، آواز کے پرکھنے والے اور پیانو کی راگوں کے نقاد کل کے کل مرد ہیں۔

لامسہ: جن آلام اور تکالیف کی متحمل عورت ہوتی ہے مرد اس قدر نہیں ہوسکتا، یہ اس کے حق میں بڑی نعمت ہے، ورنہ اس سے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہوجاتی۔

یہ واضح رہنا چاہئے کہ مرد و عورت کے دماغوں کے وزن کا یہ فرق جو اس سے قبل نقشہ میں دیا گیا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مرد کے بھیجے کا وزن اوسطاً عورت کے

بھیجے سے سو ڈرام زیادہ ہوتا ہے، یہ اختلاف صرف جسمانی اختلاف کا نتیجہ نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ یہ تحقیق ہوچکی ہے کہ مرد کے بھیجے کی مقدار اس کی جسمی حالت سے وہ نسبت رکھتی ہے جو چالیس کے عدد کو ایک سے ہوتی ہے، مگر عورت کا بھیجا اس کی جسمانی قوت سے چوالیس اور ایک کی نسبت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک عورت کے بھیجے کی کمی جسمانی ضعف پر مبنی ہے، تو مقابلۃً یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے، علاوہ اس کے عورت کے سر کے بھیجے میں پیچ وخم نہایت کم ہیں اور اس کے پردوں کا نظام بھی بالکل نامکمل ہے، اسی طرح مرد اور عورت کے بھیجوں کے جوہر سنجابی میں بھی سخت اختلاف ہے جو ہر سنجابی قوتِ ادراک کا نقطہ اور مرکز ہے۔ (مسلمان عورت، بحوالہ جواہر الحکم: ۲۲۶)

اسلام نے بھی مرد کے مقابلے میں عقل اور دین کے اعتبار سے اسے کمزور اور ناقص تسلیم کیا ہے۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَرَجَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي أَضْحَى أَوْ فِطْرٍ إِلَى الْمُصَلَّى فَمَرَّ عَلَى النِّسَاءِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ تَصَدَّقْنَ فَإِنِّي أُرِيتُكُنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ فَقُلْنَ وَبِمَ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ تُكْثِرْنَ اللَّعْنَ وَتَكْفُرْنَ الْعَشِيرَ مَا رَأَيْتُ مِنْ نَاقِصَاتِ عَقْلٍ وَدِينٍ أَذْهَبَ لِلُبِّ الرَّجُلِ الْحَازِمِ مِنْ إِحْدَاكُنَّ قُلْنَ وَمَا نُقْصَانُ دِينِنَا وَعَقْلِنَا يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ أَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَذَلِكِ مِنْ نُقْصَانِ عَقْلِهَا أَلَيْسَ إِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ قُلْنَ بَلَى قَالَ فَذَلِكِ مِنْ نُقْصَانِ دِينِهَا۔ (البخاری)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیدالاضحیٰ یا عیدالفطر میں نکلے۔ (واپسی میں) عورتوں کی جماعت پر گزر ہوا، تو آپ نے فرمایا کہ اے عورتو! صدقہ دو، اس لئے کہ میں نے تم کو دوزخ میں زیادہ دیکھا ہے، وہ بولیں یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ کیوں؟ آپ نے فرمایا کہ تم کثرت سے لعنت کرتی ہو اور شوہر کی ناشکری کرتی ہو اور تمہارے علاوہ میں نے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ دین اور عقل میں ناقص ہونے کے باوجود کسی پختہ عقل والے مرد پر غالب آجائے،

عورتوں نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہمارے دین میں اور ہماری عقل میں کیا نقصان ہے؟ آپ نے فرمایا کیا عورت کی شہادت (شرعاایک) مرد کی نصف شہادت کے برابر نہیں ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا یہی اس کی عقل کا نقصان ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ جب عورت حائضہ ہوتی ہے، تو نہ نماز پڑھ سکتی ہے اور نہ روزہ رکھ سکتی ہے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ نے فرمایا بس یہی اس کے دین کا نقصان ہے۔

پھر یہ بھی ذہن میں رہے کہ کسی بھی شئی کا، کسی شئی سے موازنہ اور مقابلہ اسی وقت کیا جاتا ہے، جب دونوں اشیاء میں داخلی اور خارجی اعتبار سے یکسانیت اور اتحاد پایا جارہا ہو، ورنہ موازنہ کرنا ہی غلط ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ کسی عورت کا موازنہ، عقل، فہم وفراست علم وقوت وغیرہ میں کسی ایسے مرد سے کیا جائے گا، جس کو اسی عورت جیسی آب و ہوا، غذا، تعلیم وتربیت، سکون وراحت میسر ہو، ساتھ ہی خاندانی اور صحت کے اعتبار سے بھی کسی قدر دونوں میں یکسانیت ہو۔ کسی تعلیم یافتہ عورت کا تقابل جاہل مرد سے، یا صحت مند کا تقابل مریض سے نہیں کیا جاسکتا ہے۔

آمدم برسر مطلب

ظاہر ہے کہ جب عورت عقل ونقل دونوں کی روشنی میں ناقص العقل اور ناقص الدین ہے، تو اگر کہیں ان عورتوں کو حق طلاق میں شریک کردیا جاتا تو یہ اپنی کم حوصلگی بے برداشتگی اور بے عقلی سے ذرا ذرا سی جزئیات میں آپے سے باہر ہوکر ہر مہینہ مردوں کو طلاقیں دے دے کرنئی نئی شادیاں کیا کرتیں اور روزانہ خدا جانے کتنے گھر برباد ہوا کرتے۔ مرد تو کہیں برسوں میں کسی بہت ہی انتہائی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے اور وہ بھی ہزاروں میں کوئی ایک اور ان میں بھی زیادہ تر جاہل طبقہ، ورنہ زیادہ تر تو عورتوں کی بدتمیزیوں پر صبر وتحمل ہی کرتے دیکھے گئے ہیں، اس لئے رہن سہن اور معاشرتی زندگی کے لحاظ سے بھی تقاضائے فطرت یہی تھا کہ عورتوں سے حق طلاق کا کوئی تعلق نہ رکھا جائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن حکیم نے عقد زوجیت میں بلحاظ فطرت، بلحاظ معاشرت اور بلحاظ خلقت زن وشوہر میں نابرابری اور فرق مراتب قائم کرکے صرف مرد کو قبولیت نکاح اور

فسخ نکاح کا مالک قرار دیا ہے اور عورت کو ان دونوں مرحلوں میں صرف اطاعت ورضا اور سر جھکا دینے کا ذمہ سپرد کیا ہے، اور اسی نابرابری کی بنیادیں نمایاں کرنے کے لئے مرد کو افضل عورت کو مفضول، مرد کو حاکم عورت کو محکوم، مرد کو قوّام عورت کو محتاج قیام، مرد کو معطیٔ مال، عورت کو خواہان مال، مرد کو کفیل اخراجات، عورت کو مکفول اخراجات، مرد کو صاحب تصرف، عورت کو محل تصرف، مرد کو با اثر، عورت کو زیر اثر قرار دیا۔

پھر اسی طرح حقِ طلاق میں بھی مرد کو مالکِ طلاق، عورت کو محلِ طلاق، مرد کو صاحبِ فسخ قبول اور عورت کو تسلیم کنندۂ فسخ قرار دے کر طلاق میں بھی دونوں کی ذمہ داریوں کے فروق واضح فرما دیئے ہیں۔

مساواتِ مرد وزن کے مفاسد

پھر بھی اگر کوئی عورتوں کی سی ہٹ دھرمی کر کے زن وشوہر کو نکاح وطلاق میں برابر کا شریک سمجھنے ہی کو عقلمندی کا نشانہ سمجھتا ہو تو اسے اس سے آگے کی مزید مساواتوں کے استقبال کیلئے بھی کمر بستہ رہنا چاہئے، جو اس کے گلے کا ہار ہو سکتی ہیں:

مثلاً اگر نظریۂ مساوات کی رو سے عورت کو مرد کی طرح نکاح وطلاق کا یکساں مالک اور ان میں برابر کا شریک تصور کر لیا جائے تو پہلی مصیبت تو یہ پیش آئے گی کہ عورت کو بھی مرد کی طرح زوج کا کفیل اور قوام بننا پڑے گا اور تمام ذمہ داریاں جو تنہا مرد پر عائد کی گئی تھیں جیسے مہر، نان ونفقہ، سکنی اور عام ضروریات زندگی کے اخراجات وغیرہ وہ سب کے سب زن وشوہر پر برابر تقسیم کر دینے پڑیں گے۔ اور یہ اس کے بغیر ممکن نہ ہوگا کہ عورت کسبِ معا ش میں آزاد ہو کر محنت ومشقت کے ساتھ جنگل، بازار اور عام سڑکوں پر بیٹھ کر کمائے اور خاوند کا آدھا پیٹ بھرے ورنہ یہ کفالت کی ذمہ داریاں وہ کس طرح پوری کر سکے گی؟ اور نہ صرف نکاح کے بعد بلکہ قبل از نکاح ہی اسے ان ساری کفالتوں کے مراحل طے کر لینے ہو ں گے، کیونکہ نکاح ہوتے ہی یہ ساری ذمہ داریاں بیک دم اس پر عملاً عائد ہو جائیں گی اور خاوند نکاح ہوتے ہی اس سے ضروریاتِ زندگی کے مصارف کا مطالبہ کرے گا۔

اگر وہ پہلے ہی سے مکان، مہر کی رقم اور نان ونفقہ وغیرہ کے مصارف مہیا نہ کرے گی تو

نکاح کرتے ہی شوہر کے مطالبہ کا کیا جواب دے گی؟ اور وہ کہاں رہے گا اور اس کے ساتھ کس طرح گذر بسر کرے گا؟ یہی وجہ ہے کہ عرف عام میں مرد شادی کی طرف قدم ہی جب اٹھاتا ہے جب وہ عورت کی کفالت کے قابل ہوجاتا ہے، ورنہ باوجود ضرورتِ نکاح کے اس عقد سے بادلِ ناخواستہ کنارہ کش رہتا ہے کہ اسے کھلائے پلائے کہاں سے؟ بلکہ ماں باپ خود بھی اولاد کی شادی میں یہی کہہ کر تاخیر کرتے ہیں کہ لڑکا کچھ کمانے کے قابل ہو جائے جب ہی شادی کی جا سکے گی، حتیٰ کہ لڑکی والے بھی رشتہ قبول کرتے ہوئے پہلے یہی دیکھتے ہیں کہ آیا لڑکا برسرروزگار ہے یا نہیں؟

ظاہر ہے کہ نظریہ مساوات ماننے پر یہی صورت عورت کی بھی ہوگی جب کہ زن وشوہر ایک دوسرے کی کفالت میں مساوی مان لئے گئے ہوں اور جب کہ انہیں عقد نکاح وطلاق میں بھی مساوی قرار دیدیا گیا ہو۔ اندریں صورت اس وقت مرد کی دو حیثیتیں ہوں گی، ایک یہ کہ آدھا شوہر ہوگا اور آدھی بیوی، اور یہی دو حیثیتیں عورت میں بھی نکلیں گی کہ آدھی بیوی ہوگی اور آدھا شوہر۔ بڑی مصیبت یہ پیش آئے گی کہ مرد اگر اسے بحیثیت آدھی بیوی ہونے کے اطاعت پر مجبور کرے اور عورت بحیثیت آدھا خاوند ہونے کے اس اطاعت سے انحراف کرنے لگے اور یہی صورت خاوند کی بھی ہو تو سوال یہ ہے کہ اس گھر کا کیا بنے گا؟ اور ان دو چکی کے پاٹوں میں معاشرہ کی گاڑی کس طرح گھسیٹی جائے گی؟ بجز اس کے کہ گھر چوبیس گھنٹے باہمی جنگ وجدل اور ناچاقیوں کا جہنم بن کر رہ جائے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ جب عورت کسبِ معاش میں پورا وقت دے گی تو گھر کا نگراں کون ہوگا اور بچوں کے پالنے اور پرورش کا نظم کیسے چلے گا؟ اور اگر اتفاق سے خاوند کی ملازمت یا ذریعۂ معاش تو اپنی بستی میں ہو اور عورت کا کسی دوسرے شہر میں تو یہ طلاق کے بغیر ہی اس دائمی جدائی سے گھریلو معاشرے پر کیا اثر پڑے گا اور اس بدنصیب گھر اور اس کی نسل پیداوار کا انجام کیا ہوگا؟ سوائے اس کے کہ شادی غمی میں تبدیل ہوکر رہ جائے اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے؟

کیا مدعیانِ مساوات مرد وزن، اس کے لئے تیار ہیں کہ عورت کے نان ونفقہ اور سکنی کی

ذمہ داری سے مرد کو سبکدوش کر دیں، یا کم از کم آدھا نفقہ عورت کے ذمہ تو کر ہی دیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر کیوں آج کل اگر شوہر نان ونفقہ میں کوتاہی کرتا ہے تو عدالتوں کے ذریعہ مرد کو نان ونفقہ ادا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

پھر اس زن وشوہر کی برابری اور حقوق کی یکسانی کے ثمراتِ بد اسی ایک حد تک رکے نہیں رہ سکتے بلکہ ان کا ایک اور بھی لمبا اور لاینحل سلسلہ سامنے آئے بغیر نہیں رہے گا، جو کسی حد پر بھی نہیں رک سکے گا۔ مثلاً مساوات پسندوں کا نظریہ نکاح کی طرح طلاق کے بارے میں بھی زن وشوہر کی مساوات ہے، ظاہر ہے کہ اس نظریہ کے تحت بہر حال طلاق کا حق بھی برابر سرابر ہی زن وشوہر میں تقسیم ہوگا، سوال یہ ہے کہ عورت کو حقِ طلاق دے کر آخر مساویانہ انداز سے بانٹنے کی کیا صورت ہوگی؟ مرد کو کتنے طلاق کا اختیار دیا جائے گا اور عورت کو کتنے کا۔ جب کہ کل طلاق کی تعداد تین ہی ہے۔

بڑی مصیبت تو عدت کے بارے میں پیش آئے گی، کیونکہ طلاق کے لئے عدت لازم ہے، سو مرد وعورت میں سے جو بھی مطلقہ ہوگا اسے عدت گذارنی ناگزیر ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جب طلاقوں میں قانونِ مساوات کی رو سے مساوات قائم ہوگی تو اسی قانون سے عدت اور اس کے لوازم میں بھی مساوات لامحالہ ماننی پڑے گی، اور سب جانتے ہیں کہ مدتِ عدت میں زیب وزینت اور خانۂ عدت سے مطلقہ کو باہر نہ نکلنے کی ساری پابندیاں مرد پر بھی عائد ہونی ضروری ہوں گی، تو جہاں تک زیب وزینت ترک کر دینے کا معاملہ ہے ممکن ہے کہ مرد اور عورت اسے کسی نہ کسی طرح انگیز کر جائیں، مگر سب سے زیادہ مشکل معاملہ طلاق یافتہ کے نان ونفقہ کا ہوگا، اگر عورت مطلقہ ہوگئی اور وہ خانۂ عدت میں تا انقضائے عدت محبوس رہی جس سے کسبِ معاش نہ کر سکی، تب تو مدتِ عدت کا نان ونفقہ مرد کا گیا اور اگر عورت نے مرد کو طلاق دیدی اور وہ خانۂ عدت میں حسبِ قانونِ مساوات مقید رہا تو آدھا نان ونفقہ عورت کا ختم ہوا، اور اگر سوءِ اتفاق سے بیک وقت دونوں ہی نے ایک دوسرے کو طلاق دیدی اور دونوں ہی خانۂ عدت میں قید ہوگئے تو اس مدت کی روزی دونو ں کی ختم ہوئی، جب کہ عامۂ غرباء کا حال (اور دنیا میں اکثریت انھیں کی ہے) روز کا کمانا

اور روز کا کھانا ہے، پھر اس عجیب وغریب قانون سے زوجین کی تو جوگت بنے گی وہ بنے ہی گی، لیکن متعلقین خانہ کا کیا حشر ہوگا جوان کے عیال میں زیر پرورش رہ کر نان ونفقہ کے محتاج ہوں گے، گویا روٹی نہ ملنے سے نیم عدت زدہ وہ بھی بن جائیں گے اور ان علمبر دارانِ مساوات کو دعائیں دیں گے، اب اس بھوک کی مصیبت میں جیسی بھی دعاء ان کی زبان سے نکلے۔

ممکن ہے کہ مساوات پرست یہ کہیں کہ طلاق یافتہ مرد کو عدت کی ضرورت نہیں، کیونکہ عدت استبراءِ رحم یعنی رحم کو خالی سمجھنے کے لئے ہوتی ہے اور مرد میں رحم اور بچہ دانی ہے ہی نہیں کہ اسے خالی سمجھنے کی ضرورت پیش آئے، تو عدت کی بھی ضرورت نہیں۔ لیکن میں عرض کروں گا کہ انھوں نے اس اعتذار سے عورت کو ظرف اور مرد کو ظرف کا پر کنندہ مان لیا، جب کہ عورت اپنی بچہ دانی کو خود تو بھر ہی نہیں سکتی مرد ہی سے بھر و اسکتی ہے اور ظاہر ہے کہ بھرنے والا فاعل ہوگا اور بھروانے والا منفعل، تو آپ نے مرد کو فاعل ومؤثر اور عورت کو منفعل ومتأثر تسلیم کرلیا، تو وہ مساواتِ مرد وزن کہاں باقی رہی جو زوجین میں حق طلاق کے مساوی ہونے کی بنیاد تھی؟ اور اسی سے عدت وغیرہ کے قصے وابستہ تھے۔ اس صورت میں مرد کے استبراءِ رحم یا عدت کا معاملہ تو بعد کا ہے، یہاں سرے سے طلاق کا وجود ہی عورت سے ختم ہوجاتا ہے، جبکہ وہ منفعل بن کر، نہ فاعل نکاح رہی نہ فاعلِ طلاق، اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر مرد کو عدت کی ضرورت نہیں کہ استبراءِ رحم کا قضیہ سامنے آئے تو آپ ہی کے مسلمات کی رو سے وہ محلِ طلاق بھی نہیں کہ عدت کی ضرورت سامنے آئے، اور جب مرد نہ محلِ طلاق رہا نہ محلِ عدت تو عورت مالکِ طلاق اور طلاق دہندہ بھی نہ رہی۔

ساتھ ہی مساوات کے علمبر داروں کو دنیا کی قوموں کے دماغوں میں بھی تبدیلی لے آنی چاہئے کہ وہ عورت کو کم رتبہ، کمزور اور کم عقل سمجھنا چھوڑ دیں اور دنیا کے سامنے کم ازکم اس مساوات پرستی کے دور میں عورت کو حقیر اور کمزور بنا کر پیش نہ کریں۔ مثلاً عموماً ملک میں جب فسادات اور خونی ہنگامے برپا ہوتے ہیں، یا سرحدوں پر کسی دشمن کے حملہ کی اطلاعات موصول ہوتی ہیں اور عوام کی جانیں خطرہ میں پڑجاتی ہیں، تو لوگ جن میں یہ

مساوات کے ڈھنڈورچی حضرات بھی ضرور شامل ہوں گے، سب سے پہلے ان خطرناک موقع سے عورتوں اور بچوں ہی کو کسی دوسری جگہ منتقل کرنے کی فکر کرتے ہیں، انھیں قطعاً یادنہیں رہتا کہ عورت مرد کے مساوی ہے اور طاقت وحوصلہ میں اس سے کم نہیں ہے، اسے ہرگز میدان سے نہ ہٹایا جائے۔

کیا یہ عورت کو مرد کے مقابلہ میں پست اور کمزور ثابت کرنا اور ذلیل ورسوا کرنا نہیں؟ کہ اسے سامان کی طرح ڈھوکر پہلے ہی کسی محفوظ مقام پر پہنچایا جائے؟ تقاضائے مساوات یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ عورت جو اپنی دانش وبینش اور زوروطاقت کی وجہ سے نکاح کے بعد خود مرد کی کفیل اور اس کے برابر تھی، ان میدانوں اور جنگی معرکوں میں بھی اس کے دوش بدوش رکھی جاتی اور سینہ تان کر دشمن کے سامنے آتی، بلکہ جب اسے بطفیل مساوات اپنے شوہر کا ایک حد تک خاوند بھی بنادیا گیا ہو، ضروری تھا کہ اسے کمانڈر اور میجر اور لفٹنٹ کے عہدوں پر فائز ہوکر اپنے شوہروں کی جنگی میدانوں میں حفاظت کرتیں اور سر میدان مردوں کی طرح آگے رہتیں، جب کہ یہ شوہر ایک حد تک ان کی بیویاں بھی ہو چکے ہوں، لیکن ایسا نہ کیا جانا کیا مساوات کا خون اور اس میں ایک عظیم رخنہ اندازی نہیں ہے

میں سمجھتا ہوں کہ اگر مساوات مرد زن کا دعوی اسی جوش خروش کے ساتھ جاری رہا، تو اندیشہ ہے کہ کل کو کہیں یہ سوال بھی نہ اٹھ کھڑا ہو کہ جب عورت مرد میں اس درجہ کی مساوات ہے کہ عورت رہ کر مردانہ حقوق کی حامل ہے اور مساوات پسند گھرانوں میں تو اس نے نکاح وطلاق کے یہ مساوی حقوق ضرور ہی حاصل کر لئے ہوں گے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اپنے مساوات پسند خاوندوں کو کہیں طلاقیں دے کر آزاد بھی کردیا ہو اور خود بھی بے گھر ہوگئی ہوں تو پھر تولید وولادت میں بھی یہ مساوات کیوں نہ رائج کی جائے اور جننے کا بار تنہا عورت ہی کے اوپر کیوں رہے کہ اس کی حیثیت محض اس ظرف اور مفعول کی سی رہ جائے جو مغلوبیت اور منفعلی کی گری ہوئی شان ہے، کیوں نہ اس میں فاعلی قوت بھی پیدا کردی جا ئے کہ انفعال کا یہ عار اس سے ہٹ جائے۔ اس لئے عورت اگر اولاد کے لئے ظرف ہے تو مرد بھی آدھوں آدھ (یعنی نصفا نصف) اس ظرفیت میں حصہ دار بنے، جب کہ وہ حق

ِ طلاق ونکاح کی مساوات سے آدھارہ جانے کے سبب نیم عورت بھی بن چکا ہے اور عورت آدھی مرد ہو چکی ہے، تو یہ تولید بھی آدھوں آدھ بانٹ دی جائے، قدرت کی بے ادبی کا عذر تو رہا نہیں، تو جیسے انسان کی رائے اور صنعت گری قانونِ خداوندی میں چلادی گئی ہے، ویسے ہی افعالِ خداوندی میں بھی چلا دئے جانے میں مساوات پسندوں کو کیا جھجک ہوسکتی ہے؟ وہ اپنی ترمیم پسندیوں کے جوش وجذبہ سے ان نیم مرد عورتوں اور نیم عورت مردوں میں یہ تولید کی مساوات بھی لاسکتے ہیں۔

بالخصوص اس دور میں جو آپریشن اور انجکشن کا دور ہے، اگر مرد میں آپریشن کے ذریعہ ایک ایک بچہ دانی فٹ کردی جائے جو آج کچھ دشوار نہیں ہے، جب کہ اس مشینی دور میں اس پر مستقلاً عمل بھی کیا جارہا ہے کہ مادہ منویہ کو کسی مشینی پمپ کے ذریعہ رحمِ مادر میں ڈال کر بلا مباشرت ہی بچے حاصل کرلئے جائیں، تو ولادت کی کلفتیں نصفا نصف بٹ کر عورت کو بھی کسی حد تک چھٹکارامل جائے گا اور مساوات بھی اپنی پوری روشنی کے ساتھ جلوہ گر ہوجائے گی، ادھر مرد جو مساوات سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں، انہیں بھی مساوات کا لطف حاصل ہوجائے گا اس میں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ ولادت اختیاری ہوجائے گی، اگر اولاد میں کمی محسوس کی گئی تو یہ تولید پمپ استعمال ہوکر اس کمی کو پورا کردیں گے اور زیادتی نظر آئی تو پمپوں کو الماری میں تاوقتِ مناسب محفوظ کریگا۔

نیز اس کا ایک دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ فیملی پلاننگ کی مصائب سے بھی رہائی مل جائے گی اور خواہ مخواہ مرد اور عورت کو اپنی اپنی تولیدی طاقتوں پر ٹانکے لگوانے نہیں پڑیں گے، جس سے گورمنٹ کا بھی لاکھوں روپیہ بچ جائے گا جب کہ یہ پمپائی تولید اختیاری بن جائے گی۔

البتہ جنسی افعال اگر کسی حد تک باقی رکھے جائیں، تو بظاہر مساوات کا قیام ذرا دشوار ہوجائے گا کیونکہ زن وشوہر میں کم از کم فوق وتحت اور نیچے اوپر کی نسبت تو پھر بھی قائم رہے گی، جس سے عورت کو توہین کا احساس ہوسکتا ہے کہ وہ نیچی کیوں ہے جب کہ وہ نکاح وطلاق کے لحاظ سے نیچی نہیں، بلکہ مساوی ہے، حتیٰ کہ نیم مرد بھی بن چکی ہے؟ تو آج کے دور میں یہ بھی مشکل نہیں ہوسکتا ہے کہ خاص آپریشن کے ذریعہ مرد کے کچھ اعضاء عورت

میں اور عورت کے مخصوص اعضاء کا مرد میں اضافہ ہوجائے، جب کہ آپریشن کے ذریعہ آج دل ودماغ، پھیپھڑے، گردے، معدہ، جگر، اور ہاتھ پاؤں حتیٰ کہ قدوقامت کی اونچائی نیچائی وغیرہ میں بھی تبدیلیاں کی جانے لگی ہیں، تو مستور اعضاء میں بھی یہ ناممکن نہ ہوگا تاکہ جنسی افعال میں رکاوٹ بھی نہ رہے اور یہ نا برابری بھی باقی نہ رہے، ورنہ وہی عدمِ مساوات کی کھٹک پھر بھی باقی رہے گی۔ بہرحال جب مقصد مساوات کی روشنی پھیلانا اور اسے زن ومرد میں عام کرنا ٹھہرا تو وہ نکاح طلاق تک ہی کیوں محدود رہے؟ زواج وولا داور عدت ومدت وغیرہ اس سے سب ہی کیوں نہ مستفید ہوں، تاکہ اس دلربا مساوات کا جلوہ ہمہ گیری اختیار کرسکے۔

اگر تبدیلیوں کی یہ سب صورتیں اختیار کرلی جائیں تو اس وقت بلاشبہ نکاح کو شرعی عقد کہنے کے بجائے باہمی معاہدہ اور آپسی سمجھوتہ کہنا زیادہ آسان اور برمحل ہوجائے گا، کیونکہ زن ومرد میں تقریباً کلی یکسانی اور برابری قائم ہوجائے گی۔ لیکن اگر نظامِ عالم وہی قدرتی ہے اور زن وشوہر کا فرق مراتب خلقی طور پر وہ رہے جو ہے، تو پھر مساوات پرست سوچ لیں کہ وہ اس مساوات کا عقیدہ باقی رکھ سکیں گے یا نہیں؟ اور رکھیں گے تو دوسروں سے اسے کیسے منوا سکیں گے؟

شرعی تغیرات درحقیقت خلقی تغیرات کے تابع ہیں، آدمی کے احوال بدلتے ہیں تو احکام بھی اس کے حق میں بدل جاتے ہیں۔ اب اگر خود شخص ہی اپنی خلقت بدل ڈالے اور وہ سابقہ شخصیت باقی ہی نہ رہے تو جو امور اس کی نفس خلقت سے متعلق ہیں قدرتاً وہ بھی تبدیل ہوجائیں گے۔ اس لئے شرائع کے نظام میں ترمیم چاہنے والے اولاً خلقی امور میں تغیرات کریں اور نظام کائنات بدلیں تب شریعت کی ترمیم کے میدان میں آئیں۔ فرق اتنا ہی ہوگا کہ وہاں قانون شریعت میں تبدیلی ہوگی، جو امر الٰہی کی ترمیم ہے اور یہاں قانون قدرت میں تبدیلی ہوگی جو خلق الٰہی کی ترمیم ہے۔

حاصل بحث

بہرحال یہ واضح ہوگیا کہ نکاح وطلاق کے شرعی عقد کا خود اپنا ذاتی تقاضہ ہے کہ زوجین میں رتبہ کی مساوات نہ ہو، اور کی جائے گی تو ہزاروں مفاسد رونما ہوں گے، اس

لئے اسے مساوات پسندوں کی نافہمی حقیقت کے سوا اور کیا کہا جائے کہ وہ اس مساوات کو نکاح کا ذاتی تقاضہ باور کئے ہوئے ہیں، حالانکہ ذاتی تقاضہ عدم مساوات ہے، جس کی تفصیلات واضح طور پر پیش کر دی گئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مساوات پرست اگر دین کا کچھ بھی علم یا ازکم از کم دین کا کوئی فہم یا اس سے بھی کم کوئی دینی ذوق ہی لئے ہوئے ہوتے اور عقل کا کچھ حصہ بھی ملا ہوتا تو انھیں نظر آتا کہ دین کے ہر ہر باب کے مسائل کا ایک مرتب سلسلہ ہے، جو باہم مربوط ہے اور جس کی ہر ایک کڑی دوسری کڑی سے جڑی ہوئی ہے۔ اگر ایک کڑی کو بھی درمیان سے نکال لیا گیا تو پوری زنجیر ٹوٹ کر بالکل بیکار بن جاتی ہے اور کوئی بھی کڑی اپنی جگہ پرفٹ باقی نہیں رہتی۔ اس لئے دین میں جزوی ترمیم جزوی نہیں رہ سکتی بلکہ کلی بن کر انجام کار پورے ہی دین کو لے بیٹھتی ہے۔ دراں حالیکہ ترمیم جزوی ہو یا کلی کفر ہی کفر ہے۔

نکاح اور آپسی معاہدوں کا فرق

مدعیان مساوات کے اس غلط نظریہ کی دوسری بنیاد یہ ہے کہ انہوں نے نکاح شرعی کو آپسی سمجھوتوں اور باہمی معاہدوں پر قیاس کر کے سمجھوتوں کے وہی آثار و احکام نکاح پر بھی لاد دیئے ہیں جو عرفِ عام میں سمجھوتوں کے رائج ہیں۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ نکاح اور آپسی معاہدے دونوں الگ الگ چیزیں ہیں اور ان دونوں میں بہت زیادہ فرق ہے، اس لئے ایک کو دوسرے پر قیاس کر کے ایک کے حکم و آثار کو دوسرے کے لئے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

نوعی فرق: ان دونوں کا پہلا اور نمایاں فرق تو یہی ہے کہ باہمی سمجھوتہ ایک خالص تمدنی اور معاشرتی چیز ہے اور نکاحِ شرعی ایک خالص دینی معاملہ ہے، وہ ازقسمِ عادت ہے اور یہ ازقسمِ عبادت، یعنی دونوں کی جنسیں ہی الگ الگ ہیں، جن میں باہم کوئی نوعی اشتراک ہی نہیں کہ ایک کو دوسرے پر قیاس کرنے کا سوال پیدا ہو۔ نکاح کو حدیث پاک میں دین فرمایا گیا ہے۔ لیکن سمجھوتہ اور معاہدۂ باہمی کیلئے کہیں بھی نصف دین یا ربع دین یا ثلث دین کا کوئی عنوان اختیار نہیں کیا گیا۔ پس کہاں عادت اور کہاں عبادت؟ چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک۔

مقصدی فرق: عموماً سمجھوتوں کے بنیادی مقاصد، دنیا کے معاشی مفادات ہوتے ہیں اور نکاح کی اساسی غرض وغایت دینی اور اخروی مفادات ہیں، گوضمناً اس میں دنیوی فوائد بھی ودیعت شدہ ہیں۔

فکری فرق: معاہدوں اور آپسی سمجھوتوں کو اگر کوئی عمر بھر بھی عمل میں نہ لائے بلکہ ان سے گریز اور اعراض ہو، تو کوئی فرق نہیں پڑتا، لیکن نکاح سے قدرت کے باوجود اگر کوئی اعراض کرے تو اسے سنت سے اعراض کرنے والا قرار دیا گیا ہے۔

اخلاقی فرق: آپسی سمجھوتوں میں فریقین کی نظر قانونی انداز سے صرف سمجھوتہ کے طے شدہ اغراض و مقاصد پر ہوتی ہے، کسی ایک فریق کو دوسرے فریق کی ذاتی دلجوئی اور مدارات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ عرف عام میں سوائے عام انسانی اخلاق کے کوئی خصوصی دلداری کا برتاؤ نہ صرف یہ کہ آپسی سمجھوتوں میں ضروری نہیں ہوتا، بلکہ مطلب پرستی یا تعلق فاسد سمجھا جاتا ہے، اس لئے فریقین اپنا وقار قائم رکھنے کیلئے اس سے بچتے ہیں، بخلاف نکاح کے کہ اس میں شوہر اور زوجہ دونوں کو خصوصی لطف و مدارات، موانست ومحبت باہمی اور اخلاق ومروت کا خاص طور سے پابند کیا گیا ہے۔

فریقین کی نوعیت کا فرق: باہمی معاہدوں کا وجود اور عدم معاہدہ کے دونوں فریق سے متعلق ہوتا ہے، معاملہ کسی ایک کے ہاتھ میں نہیں ہوتا۔ اگر کوئی ایک فریق محض اپنی مرضی کے خلاف معاہدہ کا کوئی اقدام کرتا ہے تو وہ غداری اور بیوفائی شمار ہوتا ہے اور نزاع وجدال، خصومت اور مقدمہ بازیاں قائم ہوجاتی ہیں، لیکن نکاح کا معاملہ ایک شوہر کے ہاتھ میں ہوتا ہے کہ وہ قبول کرلے تو منعقد ہوجاتا ہے، اور رد کردے تو رد ہوجاتا ہے، کہ اس کے سوا نکاح کے انعقاد ہی کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔

ردّ وفسخ کا فرق: معاہدہ کا توڑنا بھی فریقین ہی کے ہاتھ میں ہوتا ہے، طے شدہ شرائط میں فرق پڑجانے سے یا ایک کے نقض عہد کرنے سے ایک دوسرے سے جدا ہوجاتے ہیں گوایک فریق معاہدہ پر قائم بھی ہو، بلکہ اس صورت میں معاملہ عدالت میں پہنچنے پر حکومت عہد شکن کو مجبور کر کے مقررہ معاہدہ کی طرف لوٹاتی ہے یا تاوان وغیرہ عائد

کرتی ہے، لیکن نکاح کا توڑ دینا صرف اسی ایک فریق کے ہاتھ میں ہوتا ہے، جس کے ہاتھ جوڑنا تھا اور وہ شوہر ہے کہ شرعی قانون کی رو سے طلاق کا مالک بھی تن تنہا اسی کو مانا گیا ہے جس میں عورت کا دخل نہیں۔

عملی فرق: نویں یہ کہ آپسی معاہدے اور سمجھوتے فی نفسہ فریقین کے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ ہوتے ہیں۔ مفادات کا یہ تحفظ اگر کسی عمل کا طالب ہو تو عمل ضروری ہوتا ہے اور یہ مفاد اگر عمل کے بغیر محفوظ ہو تو عمل کی ضرورت نہیں رہتی۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ نفس معاہدہ بذاتہ کسی خاص عمل وفریضہ کو فریقین پر لازم و عائد نہیں کرتا بلکہ انسان میں ضرورت عمل بمقتضائے تحفظ مفاد و ترقی ہے، بخلاف نکاح کے کہ وہ بنفسہ زوجین کے لئے ان اعمال ووظائف کا تعین وتشخص کرتا ہے جن کی عدم ادائیگی بعض اوقات میں عقد نکاح کو توڑنے کا موجب بن جاتے ہیں اور بعض اوقات حقوق سے محرومی کا سبب ثابت ہوتے ہیں۔ چنانچہ مرد کی جانب سے نان ونفقہ اور مسکن مہیا نہ کئے جانے کی صورت میں عورت فسخ نکاح کے مطالبے پر حق بجانب قرار دی جاتی ہے اور اسی طرح زوجہ کی جانب سے نشوز ونافرمانی کی صورت میں زوج نفقہ ومسکن کی فراہمی کا ذمہ دار نہیں رہتا۔

انداز قبول کا فرق: آپسی معاہدوں کی ابتدا ہی فریقین کی مشترک قبولیت سے ہوتی ہے، یعنی فریقین مل کر معاملہ کے قبول کنندہ ہوتے ہیں۔ ایک بھی قبولیت سے ہٹ جائے تو معاہدہ کی صورت ختم ہو جاتی ہے، لیکن نکاح میں قبول کنندہ صرف ایک فریق ہوتا ہے جس کا نام شوہر ہے، بیوی قبول کنندہ سرے سے ہوتی ہی نہیں، وہ صرف رضا دہندہ ہوتی ہے۔ جیسا کہ اس پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے۔

ذمہ داریوں کا فرق: باہمی سمجھوتہ میں فریقین جو معاملہ طے کرتے ہیں وہ صرف معاملہ ہی کے ذمہ دار ہوتے ہیں کوئی کسی کی ذات کا ذمہ دار نہیں بنتا اور نہ ہی کوئی فریق اپنی ذات کو دوسرے فریق کے حوالہ کر کے اپنے کو اس کے اختیار میں دیتا ہے کہ خود بے اختیار بن کر رہ جائے۔ لیکن نکاح شرعی میں عورت اپنی رضا سے اپنے نفس کو مرد کے حوالہ کر کے اس کے زیر تصرف آ جاتی ہے، جس کے معنی مرد کو اپنا اختیار دیدینے اور خود کو اس کے حق

میں بے اختیار بنا لینے کے ہیں، جس سے مرد تو عورت کو قبول کر کے اس کا با اختیار ذمہ دار بن جاتا ہے اور عورت بے اختیار ہو کر محض اس کی مطیع و فرمانبردار بن جاتی ہے، جیسا کہ ''وھبت'' اور ''قبلت'' کی تفصیلی شرح آپ کے سامنے آچکی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ باہمی مفاہمت اور برابری کے سمجھوتوں میں یہ ''قبلت'' اور ''وھبت'' کے معنی کھپ ہی نہیں سکتے کہ ایک کو دوسرے کے قریب ہی کہا جا سکے۔

غلبہ کا فرق: باہمی سمجھوتوں اور معاہدوں میں، دونوں فریق میں سے کسی ایک کا دوسرے پر غلبہ یا تسلط ہوتا ہے اور نہ کوئی کسی کا تابع اور پیرو کار رہتا ہے، لیکن نکاح میں قصہ برعکس ہے۔ یہاں مرد کا عورت پر تسلط اور اقتدار حکومت قائم ہوتا ہے عورت کو صرف حوالگئ نفس کی رضا کا حق سونپا گیا ہے، جس کے تحت وہ مرد کے قبول کرنے سے پہلے اس پر رضا دیتی ہے کہ وہ اپنا نفس قبول کر لینے کے لئے مرد کو دے رہی ہے اور مرد کی قبولیت کے بعد اس کی رضا دیتی ہے کہ وہ اپنے تفویض کردہ نفس کے بارہ میں آئندہ اس کی مطیع اور پیرو کار رہے گی۔ اس لئے یہاں ان دونوں میں تابع متبوع کی نسبت ہوتی ہے نہ کہ مساوات اور برابری کی۔ اور ظاہر ہے کہ سمجھوتوں اور باہمی معاہدوں میں اگر یہ غلبہ و مغلوبیت یا تابع و متبوع کی پوزیشن آجائے تو وہ معاہدہ ہی نہیں کہلائے گا بلکہ عہد اطاعت کہلائے گا۔

منصبی فرق: باہمی سمجھوتوں اور معاہدوں میں صرف مقاصد معاہدہ فریقین کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ دونوں فریق انہی کی تکمیل و تحصیل کے لئے مساویانہ انداز سے تگ و دو کرتے ہیں عہدے اور مناصب یا ذمہ داریاں تقسیم نہیں ہوا کرتیں، لیکن عقدِ نکاح میں عہدوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم عمل میں آتی ہے۔ شوہر کو حکومت کا عہدہ دیا جاتا ہے جس سے وہ بیوی کا رکھوالا اور ذمہ داریوں والا ہو جاتا ہے اور بیوی کو اطاعت و فرمانبرداری کا منصب سپرد کیا جاتا ہے۔

شرائط کا فرق: باہمی معاہدوں میں فریقین اپنی شرائط خود طے کرتے ہیں خواہ کچھ بھی طے کر لیں اور دونوں فریق انھیں شرائط کے پابند ہوتے ہیں، لیکن نکاح میں اپنی کسی شرط کا کوئی سوال ہی نہیں اور نہ ہو سکتا ہے، جب کہ یہاں زوجین مل کر مقررہ خدائی

شرائط کے پابند ہوتے ہیں جو قانونِ خداوندی میں پہلے سے ہر مسلم امتی کے لئے متعین شدہ ہیں۔

جیسے مقصدِ نکاح اور ابتداء عورت کے لئے حوالگی نفس کی رضا، اس پر دو کی گواہی، ادھر مرد کی طرف سے قبولیت کا اقرار اور مہر ونفقہ وغیرہ کا لزوم۔ ان میں سے کون سی چیز ہے جسے زوجین باہم مل کر اختراع کرتے ہوں یا ان میں سے کون سی چیز ان کی اختیاری ہے کہ چاہے اسے عمل میں لائیں یا نہ لائیں؟ زوجین میں سے کسی کو بھی یہ حق نہیں کہ باہمی سمجھوتہ سے کوئی نکاح بلا مہر کرلیں یا ان مقررہ خدائی شروط اور حدود میں اپنی طرف سے کوئی کمی بیشی کردیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس قوم کا جو مذہبی طریقِ نکاح مقرر ہے وہ کسی بھی ملک یا دنیا کے کسی بھی خطہ میں ہو، ایک ہی متعینہ انداز کا ہوگا، دراں حالے کہ معاہدوں اور آپسی سمجھوتوں کے مقاصد، شرائط، حدود اور قیود نیز طرز واندازِ تکمیل نیز قانون اور آئین ہر ملک کا الگ، ہر قوم کا جداگانہ بلکہ ہر ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔

انتفاعات کا فرق: باہمی سمجھوتوں میں کوئی ایک فریق بھی دوسرے کی ذات یا نفس سے منتفع نہیں ہوتا بلکہ صرف اس کے مال ومتاع یا سامان واثاثے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ برخلاف نکاح کے کہ اس میں کسی مالی یا اقتصادی متاع سے منتفع ہونا مقصود نہیں ہوتا ہے، بلکہ باذنِ الٰہی ایک دوسرے کے نفس سے انتفاع مقصود ہوتا ہے۔

احکام کا فرق: باہمی سمجھوتوں میں کسی کی ذات کو حلال یا حرام نہیں بنایا جاتا اور نہ ہی فریقین میں سے کسی کی ذاتی یا حکمی نوعیت تبدیل ہوتی ہے، لیکن نکاح وطلاق میں حرام حلال، اور حلال حرام بن جاتا ہے۔ گویا ہر ایک کی ذاتی پوزیشن اور حکمی نوعیت تبدیل ہوجاتی ہے، نکاح سے پہلے زوجین ایک دوسرے پر حرام تھے اور نکاح ہوتے ہی دونوں میں حرمت کے بجائے حلت آجاتی ہے۔ اب تک ایک دوسرے پر نظر ڈالنی بھی ممنوع تھی اور نکاح ہوتے ہی قصہ برعکس ہوجاتا ہے کہ جو حصۂ بدن ایک دوسرے کی نگاہ کے لئے کلیۃً ممنوع تھا وہ کلیۃً جائز ہوجاتا ہے۔ اسی طرح جو ذوات نکاح کے ذریعہ ایک دوسرے پر حلال کردی گئی تھیں، طلاق کے بعد وہ پھر حرام ہوجاتی ہیں اور وہی پہلے کے سے احکام لوٹ آتے ہیں جو

نکاح سے پہلے قائم تھے۔

اشتراکِ عمل: معاہدۂ باہمی میں ساجھے اور شرکت کا دائرہ تنگ نہیں ہوتا، دو یا دو سے زائد افراد بھی مل کر ایک معاہدہ میں شرکت کر سکتے ہیں اور سب برابر کے حق دار ہوتے ہیں اور نہ صرف ابتداءً ہی بلکہ معاہدہ ہوجانے کے بعد بھی اس میں زائد افراد کی شرکت کی گنجائش رہتی ہے، اگر افراد بڑھ جائیں تو حسبِ شرائطِ معاہدہ ان کا حق بھی برابری کے ساتھ قائم ہوجائے گا۔ لیکن نکاح کا مقصد اس کے برعکس ہے کہ ایک نکاح میں ابتداءً بھی اور منتہاءً بھی صرف وہی دو شریک ہو سکتے ہیں جنہیں زوج اور زوجہ بننا ہے، یہ ممکن نہیں کہ زوجین کے علاوہ کسی اور کی شرکت کی بھی گنجائش نکل آئے۔ جیسے ایک عورت میں دو چار مرد مل کر ساجھا کرلیں یا ایک مرد میں دو چار بیویاں مل کر شریک ہوجائیں۔ رہا یہ کہ ایک مرد میں بیک وقت چار بیویاں شریک ہوجاتی ہیں تو یہ اس کے منافی نہیں، نہ اس مسئلہ سے اس کا تعلق ہے کیونکہ یہ چار کی شرکت ایک مرد میں ہے نہ کہ ایک نکاح اور ایک ایجاب وقبول میں، نکاح اور ایجاب وقبول ہر ایک کا الگ الگ ہوگا، جس میں ان دو کے سوا جن کا ایجاب وقبول ہوا ہے کوئی تیسرا نہ ابتداءً شریک ہو سکے گا اور نہ ہی انتہاء، کہ بعد میں کوئی اور عورت آکر سابقہ عقد میں شریک ہوجائے اور حصہ لے لے۔ پس ایک ہے ایک مرد کا چار بیویوں میں شریک ہونا، اور ایک ہے ایک عقد اور ایک ایجاب وقبول میں کئی کئی بیویوں کا شریک ہوجانا۔ پہلی صورت جائز اور حلال ہے مگر وہ زیر بحث نہیں اور دوسری صورت ناجائز اور حرام ہے اور وہی زیر نظر ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام میں بیک وقت چار بیویوں کی اجازت کے معنی چار نکاحوں کی اجازت کے ہیں، نہ کہ ایک نکاح میں چار عورتوں کو شریک کرلینے کے ہیں۔

صنفی فرق: معاہدوں کے دو فریقوں میں جیسے عدد کی کوئی قید معتبر نہیں، ایسے ہی شرکائے معاہدہ میں کوئی صنفی فرق بھی معتبر نہیں، دو طرفہ مرد ہی مرد ہوں یا دو جانب عورتیں ہی عورتیں ہوں، یا مرد وعورت کی کوئی مخلوط پارٹی ہو، باہم معاہدہ کر سکتے ہیں اور کرتے رہتے ہیں۔ دو جماعتیں، دو قومیں، دو حکومتیں اور دو ملک بھی مل کر باہمی معاہدے کر سکتے ہیں، خواہ

ان کی سربراہ عورتیں ہی ہوں، یہاں تذکیر وتانیث کے فرق کا کوئی اعتبار نہیں، لیکن نکاح میں جیسے عدد پر پابندی ہے کہ ایک عقد میں دو سے زیادہ کا شریک ہونا ممکن نہیں، ایسے ہی ان دو پر صنفی فرق کی بھی پابندی ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت ہو، جب ہی نکاح منعقد ہوسکتا ہے، دو مردوں یا دو عورتوں کا نکاح بھی منعقد نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ لغو اور عبث ہوگا۔

قرب وقرابت کا فرق: باہمی سمجھوتوں میں جیسے صنفی فرق معتبر نہیں، اسی طرح اس میں اپنے پرائے کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہوتی۔ بہن، بیٹی، باپ، اولاد اور خسر داماد وغیرہ سب ہی باہم مل کر تجارتی، اقتصادی، انتظامی اور سیاسی معاہدے کرسکتے ہیں، اپنائیت یا اجنبیت معاہدہ میں حائل نہیں ہوسکتی، لیکن نکاح میں یہ عموم ممکن نہیں کہ ماں، بہن، بہو، بیٹی جس سے چاہو نکاح کرلو، بلکہ بعض مذاہب میں تو قریب کے رشتے بھی نکاح میں حارج ہیں، جب تک کہ نسباً کافی بعد اور کھلی اجنبیت نہ ہو۔

تفریعی فرق: معاہدہ یا باہمی سمجھوتہ چند گنے چنے اور نپے تلے امور پر ہوتا ہے جو انہی امور تک محدود رہتا ہے جو سمجھوتہ سے طے ہوجاتے ہیں اور فریقین اسی کے پابند ہوتے ہیں، معاہدہ کے بعد نہ کسی زائد امر کے اضافہ کی گنجائش ہوتی ہے نہ فریقین کو اس کا حق ہوتا ہے بلکہ اگر بعد میں کوئی چیز بھی معاہدہ میں کسی کی طرف سے بڑھ جائے تو وہ موجبِ نزاع بن جاتی اور معاہدہ ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ معاہدہ سے دوسرے معاملات یا دیگر معاہدوں کی شاخیں پھوٹنے لگیں۔ لیکن نکاح کا قصہ برعکس ہے کہ نکاح سے پیدا شدہ حلال وحرام زوجین ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ شاخ در شاخ ہوکر آگے بھی چلتا ہے، جس کا خود زوجین کو بھی پابند ہونا پڑتا ہے۔ دراں حالے کہ نکاح کے وقت وہ سارے کے سارے امور نہ موجود تھے نہ ذہنوں میں تھے، چنانچہ رشتۂ زوجیت قائم ہوتے ہی جہاں زوجہ زوج پر حلال ہوجاتی ہے، اسی دم غیر زوج پر حرام بھی ہوجاتی ہے کہ اس سے نکاح نہیں کرسکتی۔ پھر زوجین کے ایک دوسرے پر حلال ہوتے ہی زوج پر زوجہ کے اور زوجہ پر زوج کے اصول وفروع حرام ہوتے چلے جاتے ہیں، ساس داماد پر اور داماد ساس پر، بہو سسر پر اور سسر بہو پر، نیز زوجہ کی حقیقی بہن تا بقائے نکاح زوج پر حرام ہوجاتی ہے۔ پھر

ان سے پیدا شدہ اولادوں میں بھی درجہ بدرجہ اور کتنے ہی حرام وحلال ہیں جو دور دور تک پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ پھر زوجہ کی شیر خوارانی سے رضاعت کا رشتہ قائم ہوجاتا ہے اور اس سے بھی حسبِ قرب وبعد حلت وحرمت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے، جس کی بنیاد یہ نکاح ہی ہوتا ہے۔

آثار ولوازم کا فرق: آپسی معاہدہ ٹوٹ جائے تو ایک لمحہ کا وقفہ دیئے بغیر وہ کلی طور پر ٹوٹ جاتا ہے، جس کا کوئی قانونی اثر بعد میں باقی نہیں رہتا، اور فریقین بھی ایک دوسرے سے بیگانہ ہوجاتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ان میں دشمنی اور عداوت بھی قائم ہوجاتی ہے۔ مروتِ باہمی کے رشتے بھی ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن نکاح اگر طلاقِ بائنہ سے ٹوٹ جائے تو وہ فوری اور کلی بیگانگی پر ختم نہیں ہوتا، بلکہ مابعد میں بھی اس کے ساتھ رفاقت کے کچھ نہ کچھ آثارِ مروت قائم رہتے ہیں، چنانچہ فسخ نکاح بذریعہ طلاق یا اختتام نکاح بوجہ وفاتِ زوج ہوتو اس کے ساتھ عدت لگی ہوئی ہے اور مدتِ عدت کا نان ونفقہ خاوند ہی کے ذمہ رہتا ہے، جو انتہائی مواساۃ ومروت ہے، اور اگر شوہر کے انتقال کر جانے سے بیوی بیوہ ہوگئی، تو یہ بھی انقطاعِ کلی نہیں، دنیا میں تو وراثت اس کے ساتھ لگی ہوئی ہے، جس کا حصہ بیوی کو ملے گا اور آخرت میں بھی بیوی پھر بھی بیوی ہی رہے گی، جسے خاوند سے منتفع ہونے کا ابدالآباد تک موقع رہے گا۔ اور اگر مطلقہ اس خاوند سے صاحبِ اولاد بھی ہوچکی تھی تو اولاد کا رشتہ جیسے ماں سے منقطع نہیں، ایسے ہی باپ سے بھی منقطع نہیں ہوسکتا، اس لئے ممکن نہیں ہے کہ اس اولاد کے سلسلہ سے یہ شوہر اور بیوی کا رشتہ کلیۃً ختم ہوجائے۔ غرض نکاح ٹوٹ کر بھی اپنے آثار سارے کے سارے سمیٹ کر اپنے ساتھ نہیں لے جاتا، بلکہ بہت کچھ چھوڑ جاتا ہے۔ جس کی وجہ اس کے سوا دوسری نہیں کہ معاہدہ محض ایک ہنگامی معاہدہ ہے، جس کا تعلق اغراض سے ہے اور نکاح ایک دینی رشتہ اور ایک قرابتی قسم کا علاقہ ہے، جس سے نسل اور کتنے ہی نسلی رشتوں کا تعلق ہے، جو فطرۃً انقطاع پذیر نہیں ہوسکتے۔

نتیجہ اور خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ نکاح اول سے لے کر آخر تک اور مجموعے سے لیکر اجزائے ترکیبی تک،

سمجھوتوں کے کسی بھی جز وکل سے میل نہیں کھاتا کہ ان کے مابین قیاس کی کوئی بنیاد قائم ہو سکے۔ سمجھوتہ خود اپنی رائے سے ہوتا ہے اور عقد شرعی خدائی تجویز سے ہے، سمجھوتوں کے آثار واحکام انسانی رایوں سے طے ہوتے ہیں،لیکن نکاح کے حقوق واحکام اوراس کی نوعیت وغیرہ نہ زوجین کے تجویز کردہ ہوتے ہیں، نہ ان کے طے کردہ، بلکہ اس کے تمام رشتے ناطے اول سے لے کر آخر تک من جانب اللہ ہیں جس میں انسانی تجویز کا کوئی دخل نہیں۔

جیسا کہ ان ذکر کردہ فروق سے، ان دونوں کا باہمی فصل بلکہ باہمی تضاد واضح ہے، جب کہ نکاح و سمجھوتہ میں نوعی، مقصدی، فکری، اخلاقی، قولی، عملی، وصفی، معیاری، انتفاعی، افاداتی، اختیاراتی، تصرفاتی، قبولیتی، منصبی، تاثیری، جزئیاتی، کلیاتی، اشتراکی، عددی، وصفی، قرابتی اور علاقائی فروق اوروہ بھی متضاد فروق رچے ہوئے ہیں، جن سے یہ دونوں ایک جگہ جمع ہی نہیں ہوسکتے ، چہ جائے کہ متحد النوع بن کر ایک دوسرے کے لئے قیاس آرائی کا محل بن سکیں اور متحد الحکم ہوجائیں، تو کون سی بنیاد باقی رہی کہ نکاح کو کسی آپسی سمجھوتہ پر قیاس کرنے کی گنجائش نکلتی ہو؟ اس لئے مساوات پرستوں کا یہ قیاس محض قیاسِ فاسد ہی نہیں بلکہ باطل اور بے بنیاد اختراع ہے، جس پر محض خیالاتی عمارت کھڑی کر کے انہوں نے نکاح کو آپسی سمجھوتہ باور کرانے کی سعیٔ نامعقول اورنامقبول کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شہوت کے دلدادہ لوگ نکاح کو محض شہوت رانی اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا ایک ذریعہ سمجھے ہوئے ہیں۔ان کے یہاں نکاح کے معنی صرف ایک جوڑا بن جانے کے ہیں، جیسے حیوانات میں نر و مادہ کا ایک جوڑا ان کے طبعی داعیہ سے بن جاتا ہے، نہ وہاں نکاح کی ضرورت ہوتی ہے نہ کسی نکاحی غرض وغایت کی، گویا ایک غیر لفظی معاہدہ اور غیر شعوری سمجھوتہ ہوجاتا ہے، جس سے وہ لغوی طور پر بھی زوج وزوجہ تو کیا بنتے البتہ ایک جوڑا بن جاتے ہیں۔

مساوات پرستوں کے یہاں بھی اسی انداز کے ایک حیوانی نکاح کا نام نکاح اور ازدواج کا نام جوڑا بن جانے کے ہیں، البتہ کچھ عقلی، طبعی اور کچھ سوسائٹی کی مجبوری کی وجہ سے جب وہ رسمِ نکاح ادا کرنے کے لئے مجبور ہوتے ہیں، تو اسے آپسی معاہدہ اور باہمی سمجھوتہ کا نام دیدیتے ہیں، تاکہ محض جانور بھی نہ کہلائیں اور آزادانہ شہوت رانیوں کی

چھوٹ بھی ملی رہے۔

مساوات کی شرعی حیثیت

مساوات کا صحیح مفہوم اسلام کے نزدیک یہ ہے کہ انسانی احترام میں مردوعورت یکساں ہیں کسی کی بے حرمتی کسی کے لئے حلال نہیں رکھی گئی۔عورت اگر ماں ہے تو اس کے قدموں کے نیچے جنت بتلائی گئی، اگر بیٹی ہے تو اسے باپ کی حسنات میں شمار کیا گیا، اگر بیوی ہے تو حسن اخلاق کے ساتھ اس کی دلداری واجب قرار دی گئی، اگر بہن ہے تو اس کی مواسات و مدارات ضروری قرار دی گئ، جس طرح سے کہ مرد بحیثیت باپ، بیٹا، بھائی اور زوج وغیرہ ہونے کے حسب درجات و مراتب احترام و اکرام کا حق دار رکھا گیا ہے۔پس جو حقوقِ انسانیت مرد کو حاصل ہیں وہی عورت کو بھی ملے ہوئے ہیں۔

غرض قانون، تعلیم، اخلاق، معاشرت، معیشت، مال ومتاع، جائیداد، زمین، باغ، املاک کسب و ہنر اور وسائل معاش وغیرہ میں جو آزادی مرد کے لئے ہے، وہی عورت کے لئے بھی تسلیم کی گئی ہے۔یہی وہ انسانی مساوات ہے جس میں اسلامی اصول پر مردوعورت میں اونچ نیچ یا امتیازی سلوک جائز نہیں رکھا گیا، بلکہ اس مساوات کو واجبات میں شمار کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا معیار انسانیت ہے جو مردوعورت دونوں میں یکساں ہے، جو صرف محمود و مستحسن ہی نہیں بلکہ شرعاً مطلوب اور دنیا کی اقوام کا مابہ الفخر ہے۔

لیکن اگر اسی مساوات کو عام بنا کر اس کا استعمال منصبوں اور عہدوں میں بھی شروع کر دیا جائے تو یہی مساوات پھر انتہائی مذموم، بھدی اور قابل ملامت بھی بن جاتی ہے، کیونکہ منصبوں اور ذمہ داریوں کی تقسیم محض انسانیت کے معیار سے نہیں ہوتی بلکہ اہلیت و قابلیت اور خلقی قوت و طاقت وغیرہ کے معیار سے ہوتی ہے۔آپ نے کہیں نہ دیکھا نہ سنا ہوگا کہ کسی ادارہ یا اجتماعی انجمن یا سرکاری حلقہ کا سربراہ کسی نابالغ بچہ یا ناتجربہ کار بے پڑھے لکھے نوجوان کو محض یہ کہہ کر بنا دیا گیا ہو کہ آخر وہ بھی تو انسان ہی ہے اور انسان انسان سب برابر ہیں، یا کسی بلند احمق کو قوم کا سردار یہ کہہ کر چن لیا گیا ہو کہ وہ انسان ہے جس کی انسانیت میں کسی کو کلام نہیں ہے، یا گورنری کی کرسیاں اور ملک کی ذمہ داریاں کسی جاہل، گنوار دیہاتی

کو سونپ دی گئی ہوں کہ وہ عام انسانوں جیسا ایک انسان ہے ۔اگر عہدوں اور منصبوں کے دائرہ میں مساوات کے علمبردار اس مساوات و جمہوریت کا نعرہ لگا کر عہدے دیئے جانے کے لئے ایجی ٹیشن شروع کردیں کہ آخر ان گنواروں کو گورنر یا وزیر اعظم یا پریسڈنٹ کیوں نہیں بنایا جاتا ہے، جب کہ انسان انسان سب برابر ہیں،تو شاید یہی دانشوران ان کی گوشمالی کے لئے کھڑے ہوجائیں گے اور یہی جواب ہوگا کہ عہدے اور منصب، ذمہ داریاں اور سربراہیاں محض انسانیت کے معیار سے تقسیم نہیں ہوسکتیں، بلکہ اہلیت و قابلیت اور مخصوص احوال و اوصاف ،معاملہ فہمی ،دانائی وتوانائی، خلقی وضع وساخت ،قدرتی اوضاع واطوار اور اکتسابی افعال وقویٰ کی قوت وضعف کے معیار سے دی جاتی ہیں،اور جب ان اوصاف کی تقسیم میں قدرت ہی نے مساوات نہیں رکھی تو پھر تفویض عہدہ جات میں یہ مساوات کہاں سے آجائیگی؟

حق تعالیٰ شانہ نے سارے انسانوں کو انسانیت اور حقوق انسانیت میں برابر رکھ کر جب اپنی کائنات میں نظام علم وعدل قائم فرمانا چاہا،تو قوت وضعف کی قدرتی نابرابری کے معیار سے اقویاء کو حکام اور عمال بنایا اور ضعفاء کو ان کا محکوم اور تابع حکم قرار دیا۔عقلاء کو بالا دست کہا اور کم عقلوں کو ان کا زیردست اور تابع فرمان قرار دیا،جس پر جمہور بنی آدم یقین رکھتے ہیں، نہ کسی کو اس سے انکار ہے نہ انحراف۔ٹھیک اسی طرح جب اس عالمی نظام عام میں نوعی بقاء کے لئے اسی کی فطرت صادقہ نے ایک مخصوص نظام منزلی قائم فرمانا چاہا تو اولاً انسانوں میں مذکر ومؤنث اور نر و مادہ کا فرق قائم فرمایا اور پھر ان میں مذکر کی جنس کو اس کے جثہ کے مطابق قوی الشعور بنایا جو اس کے مذکر ہونے کا فطری اقتضاء تھا۔اور مؤنث ہونے کا فطری مقتضا تھا۔تاکہ ایک طرف سے فعل اور تاثیر کا عمل ہو اور ایک طرف سے تأثر اور انفعال کا،جس سے نوعی بقاء کا کارخانہ قائم ہو اور آگے بڑھے۔ورنہ دونوں کے یکساں قوی اور یکساں ضعیف ہونے کی صورت میں جب کہ دونوں ہی فاعل اور دونوں ہی منفعل ہوتے تو تاثیر وتأثر اور فعل وانفعال کی کوئی صورت نہ بنتی اور ظہور نسل اور بقاء نسل ممکن نہ رہتی جو عادتاً تاثیر وتأثر اور فعل وانفعال ہی پر موقوف ہے۔اس لئے ایک کا فاعل اور مؤثر ہونا اور

دوسرے کا منفعل ومتأثر ہونا ناگزیر تھا، اور کون نہیں جانتا کہ فاعل اور قوی کو منفعل اور ضعیف پر فطرتاً غالب اور حاکم کا درجہ دیا جاتا ہے، اور ضعیف کو فاعل اور قوی کے سامنے مغلوب اور محکوم کا مقام سپرد کیا جاتا ہے، تاکہ فاعل کی تاثیر اور منفعل کے تأثر سے بقاءِ نوع اور تکثیرِ نسل کی صورت رونما ہو۔

پھر اللہ تعالی کا یہ اصول صرف نوعِ انسانی تک ہی محدود نہیں بلکہ اس نے ہر جاندار اور نسل پذیر نوع میں بھی یہی نر ومادہ کی تقسیم اور یہی فاعل ومنفعل کی تفریق جاری فرما کر اسی قوت وضعف اور تاثیر وتأثر کے معیار سے بالا دست اور زیر دست کی نابرابری وہاں بھی قائم رکھی، چنانچہ جہاں فطرتِ خداوندی نے حیوانات کی ہر ایک نوع میں عام نوعی احکام خورد ونوش، خواب وبیداری، گھونسلوں اور بھٹوں میں رہن سہن اور بقاءِ نوعی کے جذبات وغیرہ کی حد تک نر ومادہ کو مساوی کیا، وہیں ان میں اس فطرتِ الٰہی نے زوجیت اور جوڑا جوڑا بنانے میں مؤثر و متأثر اور فاعل ومنفعل کا نظام ہی قائم فرمایا کہ اس کے بغیر عادتاً کسی بھی نوعِ حیوانی میں نوعی بقاء کا سلسلہ قائم نہیں رہ سکتا، جن میں قوی کو ضعیف پر اور غالب ومؤثر کو مغلوب و متأثر پر فائق و برتر رکھا، نہ کہ اس سے پست یا اس کا زیر دست اور محکوم۔

حاصل یہ ہے کہ جیسے زن ومرد میں انسانی حقوق کی مساوات اور برابری فطرت کا اقتضاء ہے، ایسے ہی علاقۂ زوجیت نیز ذمہ دارانہ منصبوں کے لحاظ سے تفاوت اور نابرابری بھی اسی فطرت کا تقاضا ہے جو سارے جہاں کے نظامِ زوجیت چلا رہی ہے۔ پس فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ حیوانات میں یہ تفاوت اور نابرابری طبعی اور غیر شعوری ہے۔ اور یہاں عقلی اور شعوری بھی ہے کہ انسان جوہر عقل سے آراستہ ہے اور عاقبت بینی کی آنکھ رکھتا ہے۔ (ملخص از "عورت کو طلاق کا اختیار کیوں نہیں؟)

طلاق سے متعلق چند اہم مسائل

(۱) جہاں تک ہو سکے بیوی کی کمی کوتاہی کو برداشت کیا جائے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

(۲) برداشت سے زیادہ ہو جائے تو سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔

(۳) سمجھانے سے بھی کام نہ چلے تو بستر الگ کر دیا جائے یا بات بند کر دی جائے، یا کوئی ایسی مناسب تدبیر اختیار کی جائے جس سے بیوی کو یہ معلوم ہو جائے کہ میرا شوہر مجھ سے ناراض ہے۔

(۴) اگر ان تمام تدابیر سے بھی مسئلہ حل نہ ہو تو سماج کے لوگوں کو چاہیے کہ میاں بیوی دونوں کے سرپنچ مقرر کر کے معاملہ کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

تعدادِ طلاق

زمانۂ جاہلیت میں لوگ اپنی بیویوں کو سینکڑوں طلاق دے ڈالتے تھے اور پھر عدت کے اندر رجوع کر لیا کرتے تھے، جن لوگوں کو اپنی بیویوں سے دشمنی ہوتی اور وہ ان کو ستانا چاہتے تو وہ ایسے ہی طلاق دے دے کر رجوع کر لیا کرتے تھے نہ ٹھیک طور پر رکھ کر ان کے حقوق ادا کرتے نہ عدت گزار کر دوسرے سے نکاح کرنے کا موقع دیتے؛ لیکن اسلام نے عورتوں کو ظالموں کے ظلم سے بچایا اور شریعت نے طلاق کی تعداد مقرر کی کہ مرد اپنی زوجہ کو تین طلاق تک دے سکتا ہے، تین طلاقوں کے بعد عورت اس مرد کے لیے کلی طور پر حرام ہو جاتی ہے، اس عورت سے نہ رجوع کرنے کا حق باقی رہتا ہے اور نہ ہی عدت گزرنے پر عقد ثانی کا؛ مگر یہ کہ وہ عورت کسی دوسرے سے نکاح کر کے صحبت کے بعد اس

سے مطلقہ ہوجائے یا بعد جماع کے دوسرا شوہر فوت ہوجائے۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ..... فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ

ترجمہ: طلاق دومرتبہ دی جاسکتی ہے........پھر مرد بیوی کو تیسری طلاق دے دے تو پھر وہ عورت مرد کے لیے حلال نہیں ہے یہاں تک کہ وہ دوسرے مرد سے نکاح کرے۔

اقسامِ طلاق

اسلام میں طلاق دینے کے تین طریقے ہیں ہر ایک کے درجات الگ الگ ہیں:

(۱) احسن (۲) حسن (۳) بدعت

طلاقِ احسن

طلاقِ احسن یہ ہے کہ مرد اپنی بیوی کو ایسے طہر (حیض سے پاکی کے زمانے) میں ایک طلاق رجعی دے جس میں صحبت نہ کی ہو اور اس کے بعد بیوی کو چھوڑ دے یہاں تک کہ عدت گزر جائے، عدت پوری ہوتے ہی عورت نکاح سے بالکلیہ نکل جاتی ہے اور عورت کو دوسری جگہ نکاح کرنے کا شرعاً اختیار حاصل ہوتا ہے۔

طلاقِ حسن

طلاقِ حسن یہ ہے کہ شوہر تین ایسے طہر میں تین طلاق دے جن میں اس نے وطی نہ کی ہو یعنی تین طلاق میں سے ہر ایک طلاق ایسے طہر میں دی جائے جس میں عورت سے ہم بستری نہ کی گئی ہو۔

طلاقِ بدعت

طلاقِ بدعت یہ ہے کہ یک بارگی دو یا تین طلاق دیدے، مثلاً بیوی سے کہے کہ میں نے تجھے دو طلاق دیں یا تین طلاق دیں یا ایک ہی طہر میں ایک ایک کرکے دو یا تین طلاق دے اور جس کو حیض نہ آتا ہو اس کو ایک ہی مہینے میں ایک ایک کرکے دو یا تین طلاق دیدے۔

طلاق کی یہ قسم طلاقِ بدعت ہے جو شریعت کی نظر میں نہایت ناپسندیدہ امر ہے، اس کا ارتکاب کرنے والا گنہگار ہوتا ہے؛ کیونکہ اگر بدعت کا طریقہ اختیار کیا گیا تو طلاق تو پڑ جائے گی؛ البتہ اس سے عورتوں کو پریشانی لاحق ہو جائے گی اور شریعت کی رو سے یہ بات نہایت ناپسندیدہ ہے کہ بلاوجہ عورتوں کو تکلیف میں مبتلا کیا جائے۔

طلاقِ بدعت کی چند صورتیں

پہلی صورت

طلاقِ بدعت کی پہلی صورت یہ ہے کہ مرد عورت کو حالتِ حیض میں طلاق دے اور ایسا کرنا کتاب وسنت کے صریح خلاف ہے۔ ارشاد باری ہے:

''اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوْهُنَّ لِعِدَّتِهِنَّ''

دوسری صورت

طلاقِ بدعت کی دوسری صورت یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی کو ایسے طہر میں طلاق دے جس میں ہم بستری کر چکا ہو۔

تیسری صورت

بدعت کی تیسری صورت یہ ہے کہ ایک ہی طہر میں تین یا دو طلاق دی جائیں خواہ ایک جملے میں یا متفرق طور پر، ایک ہی مجلس میں یا مختلف مجالس میں ہر صورت میں طلاق کا وقوع ہو جائے گا؛ مگر ایسا کرنا خلافِ قرآن وسنت بلکہ حرام ہوگا ''شامی'' نے واضح طور پر تصریح کی ہے کہ:

"البدعي منسوب إلى البدعة والمراد به هنا المحرمة لتصريحهم بعصيانه." (شامی: ج/۲، ص/۶۷۶)

طلاقِ بدعت کی مذکورہ تمام صورتوں کے ممنوع ہونے کے باوجود ان میں دی جانے والی طلاق واقع ہو جاتی ہیں؛ چنانچہ اگر بدعت کی کسی صورت میں تین طلاقیں دی گئیں تو عورت مغلظہ ہو جائے گی۔

تفویض طلاق

تفویض طلاق کے معنیٰ ہیں طلاق دینے کا اختیار اپنی زوجہ کے سپرد کرنا، پس شوہر کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو طلاق دینے کا اختیار دے دے، مگر اس صورت میں خود شوہر کو طلاق دینے کا حق ساقط نہ ہوگا۔ لہٰذا عورت کا مرد سے نکاح کے وقت یہ شرط کرنا کہ اسے طلاق کا اختیار حاصل ہوگا شریعت کے اعتبار سے صحیح ہے، اسی طرح شوہر کا اپنی زوجہ کو نکاح ہونے کے درمیان طلاق کا اختیار دینا بھی جائز ہے۔

اگر زوجہ نے نکاح کے وقت شوہر سے طلاق کا حق حاصل کر لیا ہو یا وہ نکاح کے بعد اس حق کی مالک بن گئی ہو، تو وہ اس حق کو استعمال کر کے خود کو طلاق دے کر رشتۂ زوجیت ختم کر سکتی ہے اور اس طلاق کا اسی طرح اعتبار کیا جائے گا جیسا کہ شوہر نے زوجہ کو وہ طلاق خود دی ہو۔

عورت کو طلاق کا مالک بنانے اور اس (طلاق) کا اختیار دینے کے بعد شوہر زوجہ کے اس حق کو فسخ نہیں کر سکتا، کیونکہ تفویض کے بعد زوجہ اس اختیار کی بنفسہٖ مالک ہو جاتی ہے خواہ اس حق کو استعمال کرے یا نہ کرے اور جب چاہے کرے، البتہ اگر تفویض طلاق متعین مدت کے لیے ہو اور وہ مدت گزر جائے تو عورت کا حق باطل اور بے اثر ہو جائے گا۔

تعلیق طلاق

تعلیقِ طلاق سے مراد طلاق کو کسی شرط کے ساتھ معلق کرنا۔ مثلاً بیوی سے کہنا کہ اگر تُو نے فلاں کام کیا تو تجھے طلاق، تو بیوی جیسے ہی وہ کام کرے گی اُس پر طلاق بائن پڑ جائے گی۔ فرض کیجئے شوہر نے بیوی سے کہا کہ اگر تو میکہ گئی تو تجھے طلاق، تو بیوی کے میکہ جاتے ہی طلاق بائن پڑ جائے گی یا مثلاً کہا: فلاں مہینہ کی پہلی تاریخ کو تجھے طلاق تو اس مہینہ کی پہلی تاریخ شروع ہوتے ہی طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔

وکیل بالطلاق

ہر مسلمان شوہر کو اِس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی زوجہ کو خود طلاق دے یا دینے کا کسی عاقل و بالغ شخص کو اپنا وکیل مقرر کرے۔

یہ مسئلہ متفقہ ہے کہ طلاق شوہر خود دے سکتا ہے اور چاہے تو اپنے متعین کئے ہوئے

وکیل کے ذریعہ دلوا سکتا ہے؛ لیکن طلاق کے واقع ہونے کے لیے صریح طلاق کی نسبت اپنی زوجہ کی طرف کرنا شرط ہے۔ طلاق کے وکیل کے لیے ضروری ہے کہ وہ عاقل و بالغ ہو، اگر وکیل نابالغ ہوگا تو اس کی دی ہوئی طلاق واقع نہ ہوگی، وکیل کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اُسے طلاق کا اختیار صراحتاً دیا گیا ہو۔

کسی دوسرے شخص کو طلاق کا وکیل مقرر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص اس اختیار کے استعمال پر مامور ہوتا ہے اور اس کا پابند ہوتا ہے کہ وہ اس اختیار کو (حسبِ ہدایت اپنے مؤکل) استعمال میں لائے۔ وکیل کی صورت میں شوہر کو ہر وقت یہ اختیار حاصل ہے کہ وکیل کو دیے ہوئے اختیار کو واپس لے لے یا وکیل کے اس اختیار کو کسی خاص وقت تک محدود کر دے، بشرطیکہ وکیل نے اس سے قبل اس اختیار کو استعمال نہ کیا ہو؛ البتہ وکیل اگر دیوانہ ہو جائے تو وکالت خود بہ خود ساقط ہو جائے گی۔

نوٹ: اہلیتِ طلاق سے متعلق جو قیود و شرائط خود شوہر سے متعلق ہیں وہ وکیل سے بھی متعلق ہوں گی۔

الفاظ کے اعتبار سے طلاق کی قسمیں

الفاظ کے اعتبار سے طلاق کی دو قسمیں ہیں:

(۱) طلاقِ صریح (۲) طلاق کنائی۔

طلاقِ صریح

اگر شوہر رشتۂ نکاح فسخ کرنے کے لیے کسی بھی زبان کا کوئی بھی ایسا لفظ استعمال کرے جس کا معنیٰ سوائے طلاق کے کچھ اور نہیں ہوتا تو اس کو طلاقِ صریح کہتے ہیں۔ وہ لفظ استعمال کرتے ہی فوراً طلاق پڑ جائے گی، خواہ الفاظ زبان سے ادا کیے ہوں یا لکھ کر دیے ہوں، نیت کا اعتبار نہیں کیا جائے گا مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے صاف لفظوں میں کہا: میں نے تجھے طلاق دی یا میں نے اپنی بیوی کو طلاق دی تو فوراً طلاق پڑ جائے گی چاہے طلاق کے الفاظ بیوی نے سنے ہوں یا نہ سنے ہوں اور چاہے ہنسی مذاق میں طلاق دی ہو یا سوچ سمجھ کر، حدیث میں ارشاد ہے:

ثلاث جدّهنّ جدٌّ وهزلهنّ جدٌّ: النكاح والطلاق

والرجعة. (مشکوٰۃ شریف: ۲۸۴)

''تین باتیں ایسی ہیں جن کو سنجیدگی اور قصد وارادے سے کہنا یا ہنسی مذاق کے طور پر کہنا دونوں برابر ہیں ایک نکاح دوسری طلاق تیسری رجعت''

طلاقِ کنائی

بعض مرتبہ آدمی ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جن کے دو مطلب ہوتے ہیں اگر کسی نے ایسے گول مول الفاظ استعمال کیے ہیں جن کا مطلب طلاق بھی ہوسکتا ہے اور طلاق کے علاوہ کوئی دوسرا معنیٰ بھی ہوسکتا ہے تو ایسی طلاق کو ''طلاقِ کنائی'' کہتے ہیں۔ مثلاً کسی نے اپنی بیوی سے کہا میں نے تجھے دُور کردیا تو اس جملے کے دو مطلب ہوسکتے ہیں: ایک یہ کہ میں نے تجھے طلاق دے کر دُور کردیا اور دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں آیندہ تجھے اپنے پاس نہیں رکھوں گا ہمیشہ کے لیے میکہ چلی جا، یا مثلاً کہے تو عدت میں بیٹھ جا، یا اپنی رحم کو خالی کرلے۔

لہٰذا ایسے گول مول اور معنیٰ دار لفظ بول کر شوہر اگر طلاق کی نیت کرے تو ایک طلاق بائن پڑ جائے گی، اب رجوع نہیں کرسکتا؛ البتہ باہمی رضامندی سے مہر وگواہ کے ساتھ دوبارہ نکاح کرسکتا ہے، نیز اگر الفاظِ کنائی سے طلاق کی نیت نہیں کی تھی تو طلاق نہیں پڑے گی۔

حکم کی اعتبار سے طلاق کی قسمیں

حکم کے اعتبار سے طلاق کی تین قسمیں ہیں:

(۱) طلاقِ رجعی (۲) طلاقِ بائن (۳) طلاقِ مغلظہ

(۱) طلاقِ رجعی

طلاقِ رجعی وہ ہے جس کے بعد شوہر دورانِ عدت رجوع کرسکتا ہے، دوبارہ نکاح کی ضرورت نہیں مثلاً کسی نے صاف لفظوں میں ایک یا دو طلاق دی تو اس کے لیے گنجائش ہے کہ وہ عدت کے اندر رجعت کرلے۔

طریقۂ رجوع: اگر عدت کے اندر اپنی زوجہ سے رجعت کرنا چاہے تو اس کی سب سے بہتر صورت یہ ہے کہ وہ گواہوں کی موجودگی میں اپنی زبان سے صاف صاف کہہ دے

کہ میں تجھ سے رجوع کرتا ہوں، اگر عورت سامنے نہ ہوتو یہ کہہ دے کہ میں اپنی بیوی سے رجوع کرتا ہوں۔ رجوع کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ زبان سے کہنے کے بجائے بیوی سے صحبت کرے یا بوس و کنار کرے یا شہوت کے ساتھ اس کو چھولے، ایسے بھی رجوع ہو جائے گا، مگر پہلا طریقہ مستحب ہے۔

معاوضۂ رجعت: رجعت کے لیے کسی معاوضہ کی ضرورت نہیں، کیونکہ رجعت کے ذریعہ اس چیز کو جو پہلے سے موجود تھی (یعنی نکاح) آیندہ برقرار رکھا جاتا ہے؛ لہٰذا اس کے لیے معاوضہ کی ضرورت نہیں، یہی وجہ ہے کہ رجوع کرنے کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری نہیں ہے۔ رجعت کا حق صرف شوہر کو حاصل ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے رجعت کا حق صرف شوہر کو دیا ہے، چنانچہ ارشاد باری ہے: ''وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ'' یعنی ان کے شوہر ان سے رجوع کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔

(۲) طلاقِ بائن

بائن ایسی طلاق ہے جس میں نکاح بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور نئے نکاح کے بغیر اس مرد کے پاس رہنا جائز نہیں ہوتا، اگر آیندہ میاں بیوی آپس میں رہنا چاہیں اور دونوں اس پر راضی بھی ہوں تو نئے سرے سے نکاح کرنا پڑے گا۔

(۳) طلاقِ مغلظہ

تین طلاق کو طلاقِ مغلظہ کہتے ہیں خواہ یک بارگی دی گئی ہو یا الگ الگ، طلاقِ مغلّظہ کے مقابلہ میں ایک یا دو طلاق کو طلاقِ مخففہ کہا جاتا ہے نیز طلاقِ مغلّظہ کو بائن کبریٰ اور اس کے مقابل میں طلاقِ بائن کو طلاقِ صغریٰ بھی کہا جاتا ہے۔

یہ ایسی طلاق ہے جس میں رجعت کی گنجائش نہیں ہوتی، عورت مغلظہ ہو جائے گی اور اب اس شوہر سے نکاح کی صورت نہیں ہے۔ صرف ایک راستہ ہے کہ عدت گزرنے کے بعد اس عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح ہو جائے اور وہ اس سے ہم بستر بھی ہو جائے، پھر کسی وجہ سے وہ بھی اپنی مرضی سے طلاق دیدے یا بعد جماع کے اس کا انتقال ہو جائے پھر عدت بھی گزر جائے تو اب اس عورت کا پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہے:

''فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّىٰ تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ''
(پس اگر مرد اس عورت کو (تیسری) طلاق دیدے تو پھر اس کے بعد وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوگی، یہاں تک کہ دوسرے شوہر سے نکاح کرلے۔)

کن کن لوگوں کی اور کن صورتوں میں طلاق واقع ہوگی؟

(۱) طلاق دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ عاقل ہو اور صاحبِ عقل ہونے کی شرط شوہر کے وکیل (جس کو طلاق کا وکیل بنایا ہے) پر بھی عائد ہوتی ہے؛ چنانچہ دیوانے، پاگل، مدہوش اور سوئے ہوئے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوگی۔

(۲) طلاق دینے کی اہلیت کی دوسری شرط بالغ ہونا ہے؛ لہٰذا بچے کی دی ہوئی طلاق واقع نہیں ہوگی، خواہ بالغ ہونے کے قریب ہی کیوں نہ ہو۔

(۳) شراب کے نشے میں دی ہوئی طلاق واقع ہوجاتی ہے۔

(۴) ہنسی مذاق میں دی گئی طلاق واقع ہوجاتی ہے، خواہ طلاق کی نیت نہ ہو۔

(۵) غصّہ کی حالت میں دی گئی طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے۔

غیر مدخولہ کو طلاق

اگر زوجہ غیر مدخولہ ہو یعنی اس سے صحبت نہ ہوئی ہو اور اس کو ایک کلمہ سے تین طلاقیں دی جائیں تو تینوں طلاقیں ایک ساتھ واقع ہوجائیں گی اور عورت مغلظہ ہوجائے گی؛ البتہ اگر تین طلاقیں الگ الگ دی گئیں تو پہلی طلاق سے وہ زوجہ بائنہ ہوجائے گی اور باقی دو طلاقیں بے اثر رہیں گی، اس صورت میں مرد و عورت دونوں نکاح جدید کرسکتے ہیں۔

کن لوگوں کی طلاق واقع نہیں ہوتی؟

حسبِ ذیل لوگوں کی طلاق واقع نہیں ہوگی:

(۱) نابالغ کی طلاق بالاتفاق واقع نہیں ہوگی، اگرچہ وہ بالغ ہونے کے قریب ہو، اگر لڑکے نے بالغ ہونے سے پہلے طلاق دی اور بالغ ہونے کے بعد اس سابق طلاق کو بحال رکھا تب بھی وہ (سابق) طلاق واقع نہ ہوگی، کیونکہ وہ ابتدا ہی سے طلاق دینے کا اہل نہ تھا۔

نوٹ: بالغ کی عمر کا تعین شریعت اسلامی کے مطابق ہوگا نہ کہ قانونِ بلوغ Majority

Act کے تحت۔

(۲) پاگل و مدہوش، اسی طرح ایسے شخص کی طلاق واقع نہیں ہوتی جس پر بے ہوشی طاری ہو، اس لیے کہ بے ہوشی ایک بے اختیار نیند کے مانند ہے جو بالعموم ضعفِ قلب کی وجہ سے طاری ہوتی ہے، چونکہ نیند کی حالت میں انسان کا دل و دماغ اپنے قابو میں نہیں رہتا، اس لیے اس شخص کو احکام شرع کا مکلف قرار نہیں دیا جا سکتا، اس بنا پر بے ہوش شخص کی طلاق بالاتفاق واقع نہیں ہوگی۔

(۳) سوئے ہوئے شخص کی طلاق بالاتفاق واقع نہیں ہوتی؛ کیونکہ اس کا کلام معتبر نہیں ہے، اگر ایک شخص نے خواب کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی، اس کے بیدار ہونے کے بعد کسی نے اس سے کہا کہ تو نے نیند کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دی ہے، یہ سننے کے بعد اس شخص نے اس طلاق کو بحال رکھا اور کہا کہ میں نے اس طلاق کو جائز رکھا یا واقع کیا تو وہ طلاق واقع نہ ہوگی کیونکہ اس شخص نے اپنے کلام یعنی طلاق کو خواب کی حالت پر منحصر کیا ہے، جو غیر معتبر ہے؛ لیکن اگر اس شخص نے اس طرح کہا کہ یہ طلاق میں نے واقع کی تو اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ واقع ہونے والی طلاق ''خواب کی طلاق'' نہیں ہے، بلکہ از سرِ نو طلاق ہے۔

ارتداد کا اثر مہر و نکاح پر

اگر کسی عورت کا شوہر اسلام سے پھر جائے اور مرتد ہو جائے خواہ عیسائی، یہودی ہو کر یا ہندو اور قادیانی ہو کر تو اس کا نکاح خود بہ خود فسخ ہو جائے گا اور فسخ کے لیے قاضی کے فیصلے یا حاکم کے حکم کی ضرورت نہیں، اس پر علمائے امت کا اجماع ہے۔

درّ مختار میں ہے کہ: زوجین میں سے کسی ایک کے مرتد ہو جانے سے فی الفور (فوراً) عقدِ نکاح فسخ ہو جاتا ہے، قضائے قاضی (حکمِ عدالت) کی ضرورت نہیں؛ اگر ارتداد شوہر کی جانب سے ہو اور صحبت ہو چکی ہو تو عورت پورے مہر کی مستحق ہوگی؛ لیکن اگر عورت مرتد ہو جائے اور صحبت نہ ہوئی ہو تو ایسی صورت میں وہ مہر پانے کی مستحق نہ ہوگی؛ البتہ صحبت ہو جانے کی صورت میں وہ پورا مہر پانے کی مستحق ہوگی۔

خلع

خلع کا لفظ خَلْعٌ سے ماخوذ ہے، خلع کے لغوی معنیٰ ایک شئ سے دوسری شئ نکالنے کے ہیں اور اصطلاحِ شرع میں بیوی سے کچھ مال لے کر (خواہ مہر ہو یا کچھ اور) اس کو نکاح سے آزاد کر دینے کا نام ہے، یہ ایسی صورت میں ہے جبکہ میاں بیوی میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکے اور مرد طلاق بھی نہ دیتا ہو تو عورت کے لیے جائز ہے کہ کچھ مال دے کر یا اپنا مہر دے کر مرد سے کہے: ''اتنا روپیہ لے کر میری جان چھوڑ دو'' یا یوں کہے: ''جو میرا مہر تیرے ذمہ ہے اس کے عوض میری جان چھوڑ دو'' اس کے جواب میں مرد کہے: ''میں نے چھوڑ دیا''، تو اس سے عورت پر ایک طلاقِ بائن پڑ گئی۔ مرد کو اس میں رجوع کا اختیار نہیں، البتہ اگر مرد نے اسی جگہ بیٹھے بیٹھے جواب نہیں دیا بلکہ اس جگہ سے اُٹھ گیا یا مرد تو نہیں اُٹھا، عورت اُٹھ گئی، پھر مرد نے کہا اچھا میں نے چھوڑ دیا تو اس سے کچھ نہیں ہوا، جواب اور سوال دونوں ایک ہی جگہ ہونے چاہئیں، اس طرح نکاح ختم کر کے جان چھڑانے کو ''خلع'' کہتے ہیں۔

❁❁❁

عدت

اُس نکاح کے زوال کے بعد جس میں صحبت ہوئی ہو یا شوہر مر گیا ہو، عورت کا ایک متعین زمانہ تک دوسرے نکاح سے رُکنا عدت کہلاتا ہے۔

شریعتِ اسلامیہ میں عدت دراصل وہ ایام ہیں جو عورت پر شوہر کی ملکِ تمتع زائل ہونے کے بعد اس کو انتظار میں گزارنے لازم ہوتے ہیں، بشرطیکہ شوہر نے اس سے صحبت کی ہو یا خلوتِ صحیحہ (میاں بیوی کے درمیان ایسی تنہائی ہو جس میں صحبت سے کوئی چیز رُکاوٹ نہ بنے) ہو گئی ہو یا شوہر مر گیا ہو؛ چنانچہ جس عورت سے نکاح یا نکاح بالشبہ کی صورت میں صحبت کی گئی ہو اس پر بھی عدت کے احکام نافذ ہوں گے۔

حسبِ ذیل صورتوں میں عورتوں پر عدت واجب ہوتی ہے

(۱) نکاح جائز میں دخول یا خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق دی جائے یا تفریق ہو جائے۔

خلوتِ صحیحہ کا مطلب یہ ہے کہ میاں بیوی میں ایسی تنہائی ہو جس میں صحبت سے کوئی حقیقی یا شرعی یا طبعی رُکاوٹ نہ ہو، ایسی صحبت احناف کے نزدیک ہم بستری کے حکم میں ہے، لہٰذا جس طرح ہم بستری سے پورا مہر واجب ہوتا ہے، اسی طرح خلوتِ صحیحہ سے بھی پورا مہر واجب ہو جاتا ہے۔ نامرد کی خلوتِ صحیحہ بھی معتبر ہے، اس کی وجہ سے بھی پورا مہر واجب ہوگا۔

(۲) نکاح جائز یا فاسد میں شوہر کا انتقال ہو جائے، تب بھی عورتوں پر عدت واجب ہوگی۔

ایامِ عدت

(۱) بالغہ مطلقہ عورت جس کو حیض آتا ہو اس کی عدت تین حیض ہے۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ''مطلقہ عورتوں کی عدت تین حیض

ہے‘‘۔ جب تک یہ عدت نہ گزر جائے عورت کا کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنا ممنوع ہے۔

اگر شوہر نے زوجہ کو حالتِ حیض میں طلاق دی تو ایسی عورت پر تین حیض کامل عدت واجب ہوگی اور وہ حیض جس میں طلاق دی گئی ہے تین حیض میں شمار نہ ہوگا۔

(۲) وہ مطلقہ عورتیں جن کو حیض نہیں آتا ان کی عدت تین ماہ ہے، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَ الّٰٓـِٔیْ یَىٕسْنَ مِنَ الْمَحِیْضِ مِنْ نِّسَآىٕكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ

یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسی عورتوں کے معاملے میں جنہیں حیض سے مایوسی ہو تین مہینے کی عدت مقرر فرمائی ہے۔

اگر طلاق یا تفریق کے وقت حیض آیا ہو مگر دورانِ عدت بند ہو گیا ہو تو ایسی عورت کی عدت تین ماہ ہوگی، جو حیض بند ہونے کے وقت سے شمار ہوگی۔

(۳) جس عورت کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے اس کی عدت چار ماہ دس دن ہوگی۔

اگر شوہر نے طلاقِ رجعی دی اور عدت کے دوران شوہر مر گیا تو عورت پر تاریخِ وفات سے چار ماہ دس دن کی عدت واجب ہوگی۔

اسی طرح اگر طلاقِ بائن دی تھی تو جس عدت کے گزرنے میں زیادہ دن لگیں گے وہی عدت واجب ہوگی مطلقاً یہ کہنا کہ وفات کی عدت واجب ہوگی درست نہیں۔

(۴) اگر زوجہ حاملہ ہے تو اس کی عدت وضعِ حمل (بچہ جننے) تک ہوگی۔ جیسا کہ قرآن میں ہے: ’’وَ اُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ یَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ‘‘ یعنی حاملہ عورتوں کی عدت یہ ہے کہ وہ اپنا حمل جنیں؛ چنانچہ حاملہ کے لیے عدت کی کوئی مدت مقرر نہیں ہے، اگر طلاق کے چند گھنٹے بعد ہی وضعِ حمل ہوجائے تو اُسی وقت عدت ختم ہوجائے گی۔

اگر طلاق یا تفریق یا شوہر کی وفات کے وقت حمل کے آثار نہ تھے، مگر عدت میں حمل ظاہر ہو گیا تو عدت وضعِ حمل تک ہوگی۔

دورانِ عدت نفقہ ورہائش کا حکم

طلاق کی عدت کا نفقہ، کھانا، کپڑا اور رہائش کا انتظام اس مرد کے ذمہ ہے جس نے طلاق دی ہے؛ البتہ اگر شوہر کی وفات ہوگئی ہے تو کھانے کپڑے وغیرہ کا انتظام خود اسی عورت کے ذمے ہے، لیکن وہ بھی عدت اپنے شوہر ہی کے گھر گزارے گی۔

دورانِ عدّت سوگ کرنا

جس عورت کو طلاقِ رجعی ملی ہے اس کی عدت تو صرف یہی ہے کہ اتنی مدت تک گھر سے باہر نہ نکلے اور نہ کسی اور مرد سے نکاح کرے۔ اس کے لیے بناؤ سنگار وغیرہ درست ہے اور جس کو تین طلاقیں مل گئیں یا ایک طلاق بائن ملی یا اور کسی طرح سے نکاح ٹوٹ گیا یا شوہر فوت ہوگیا، ان سب صورتوں کا حکم یہ ہے کہ جب تک عدت میں رہے تب تک نہ تو گھر سے باہر نکلے، نہ دوسرا نکاح کرے، نہ بناؤ سنگار کرے، یہ سب باتیں اس پر حرام ہیں۔ اس سنگار نہ کرنے کو ''سوگ'' (عدت گزارنا) کہتے ہیں۔

البتہ سر میں دَرد ہونے کی وجہ سے تیل ڈالنے کی ضرورت پڑے تو جس تیل میں خوشبو نہ ہو وہ ڈالنا درست ہے۔ اسی طرح ضرورت کے وقت بطور دوا کے سرمہ لگانا بھی درست ہے، لیکن رات کو لگا کر دن کو صاف کرلے۔ سر دھونا اور نہانا بھی درست ہے، ضرورت کے وقت کنگھی کرنا بھی درست ہے، لیکن باریک کنگھی سے کنگھی نہ کرے جس میں بال چکنے ہوجاتے ہیں، بلکہ موٹے داندانے والی کنگھی کرے تاکہ خوبصورتی نہ آنے پائے۔

بچہ کی پرورش کا حق

میاں بیوی میں جدائی ہوگئی اور عورت کی گود میں بچہ ہے تو اس کی پرورش کا حق ماں کو ہے، باپ اس کو نہیں چھین سکتا، لیکن بچہ کا سارا خرچ باپ ہی کو دینا پڑے گا۔ اگر ماں خود پرورش نہ کرے، باپ کے حوالے کردے تو باپ کو لینا پڑے گا، عورت کو زبردستی نہیں دے سکتا۔

اگر ماں نہ ہو یا ہو لیکن اس نے بچہ کو لینے سے انکار کردیا تو پرورش کا حق نانی اور پرنانی

کو ہے ان کے بعد دادی اور پردادی۔ یہ بھی نہ ہوں تو سگی بہنوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بھائی کی پرورش کریں، سگی بہنیں نہ ہوں تو سوتیلی بہنیں۔ ماں شریک بہنوں کا حق باپ شریک بہنوں سے پہلے ہے، پھر خالہ، پھر پھوپی کا۔

۞ ۞ ۞